فکر تونسوی

شخصیت اور طنز نگاری

یونس حیدرآبادی

فکر تونسوی

شخصیت

اور

طنز نگاری

سید نصیر الدین احمد
بوگس، حیدرآبادی، ایم۔ اے (عثمانیہ)

○ کتاب : فکر تونسوی، شخصیت اور طنز نگاری
○ مُصنّف : سید نصیر الدین احمد بوگس حیدرآبادی ایم۔ اے (عثمانیہ)

○ تاریخ اشاعت : مئی ۱۹۸۰ء
○ تعداد : پہلی بار؛ ایک ہزار
○ قیمت : زیادہ سے زیادہ ۲۵ روپے
کم سے کم صرف ۲۰ روپے

○ سرورق : جناب سعادت علی خاں
○ کتابت : ابتدائی صفحات : سلام خوشنویس
○ پورے مقالہ کی کتابت : محمّد غالب
○ عنوانات : محمود سلیم

○ پریس : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان۔ حیدرآباد
○ بلاکس : (سرورق اور تصاویر)
نیمس بلاک ورکس، مچھلی کمان، حیدرآباد

○ اِعانت : اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش

○ ناشر : زندہ دلانِ حیدرآباد، ۲۷ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

○ ملنے کے پتے :
○ اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش، اے۔ سی گارڈنز۔ حیدرآباد
○ الیاس ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ روڈ، حیدرآباد
○ ماہنامہ شگوفہ، ۳۱ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
مُصنّف : 13-2-784/1 کاغذی گوڑہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۶

والد محترم حضرت سیّد عزیز الدّین احمد جنّت مکانی کے نام

جن کی شفقتوں اور دُعاؤں کے طُفیل

آج مَیں اِس قابل ہُوا!

ترتیب

★★

پیش لفظ

جنابِ سید نصیر الدین احمد، بوگس حیدرآبادی سے میری اُس وقت سے شناسائی ہے، جب سے میں زندہ دلانِ حیدرآباد میں آیا ہوں۔

حال ہی میں نے ان کو زندہ دلان کے پہلے مشاعرہ میں آدھی غزل پڑھتے ہوئے سُنا تھا۔ آدھی غزل سے مُراد ہے، پہلا مصرع اِن کا ہوتا ہے اور دوسرا مرزا غالب کا۔ آدھی غزل اور ان کے پڑھنے کا اِسٹائیل مُنفرد ہے۔ آدھی غزل کے موجد پورے بوگس حیدرآبادی کی غزلیں نہ صرف ریاستِ آندھرا پردیش بلکہ سارے مُلک میں سَراہی گئی ہیں، پسند کی گئی ہیں۔ مُلک کی کئی ریاستوں کے کُل ہند مشاعروں کو لُوٹا ہے۔ بوگس صاحب اب ایک کامیاب مزاحیہ شاعر تسلیم کیے جا چکے ہیں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص شاعر ہو، قافیہ ردیف، وزن رُکن وغیرہ پر دسترس رکھتا ہو، اس کے لیے نثر لکھنا بچوں کا کھیل ہوتا ہے۔ چنانچہ اِن کا پورا مقالہ پڑھنے کے بعد میرا پہلا اور آخری تاثر یہ ہے کہ موصوف نے اپنے موضوع کے ساتھ بہتر سلوک کیا ہے اور جناب فکر تونسوی پر فکر انگیز مواد یکجا کر دیا ہے۔

بوگس صاحب کافی محنت و جستجو کے بعد فکر صاحب کی پیدائش سے موجودہ زندگی تک کے حالات کو بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ فکر صاحب کی شخصیت اور طنز نگاری پر یہ ابتدائی کام ہے لیکن یہی ابتدائی کام آئندہ کام کرنے والوں کے لیے ضرور سہولت کا باعث ہوگا۔

بوگس صاحب نے طنز کیا چیز ہے اور مزاح کیا ہے، کے موضوع پر کافی ٹھوس کام کیا ہے۔ "طنز و مزاح کا تاریخی پس منظر" پر بھی جامع اور فکر انگیز نظریات کو بہت ہی دلکش انداز میں اکٹھا کر دیا ہے۔ انھوں نے ان موضوعات کے تعلق سے زمانۂ قدیم کے یونانی اور روم کے مفکروں سے لے کر برطانوی، فرانسیسی، جرمنی اور دیگر ممالک کے فلسفیوں کے نظریات کو اپنے موضوعِ فکر کا محور بنایا ہے۔ ان کے علاوہ فارسی اور عربی کے اساتذہ کے خیالات اکٹھا کر کے بالآخر ہندوستانی اور پاکستانی نقادوں کے نظریات کو بھی پیش کیا ہے۔ میرے خیال میں اس مضمون پہ ان کا مقالہ کافی مبسوط مستند اور مکمل ہے، جو شخص یہ جاننا چاہتا ہو کہ مزاح و ظرافت اور طنز میں بنیادی فرق کیا ہے اور یہ کہ وہی مزاح اور طنز کارگر اور ہمہ وقتی اثر کا حامل ہوتا ہے، جس میں راقم فطرتِ انسانی کی لغزشوں کے باعث سماج میں پیدا ہونے والے ناسوروں پر اپنی اُنگلی رکھ دیتا ہے اور اُن کو اپنے طنز کے تیروں اور نشتروں کا نشانہ بناتا ہے، اُس کا مقصد یا "پیغام" یہ ہوتا ہے کہ جس بُرائی یا خرابی کو نشانہ بنایا گیا ہے، اُس کی اِصلاح ہو سکے اور وہ دُور ہو جائے۔

شخصیت کے موضوع پر بھی بوگس صاحب نے فکر صاحب کی ابتدائی زندگی سے ہندوستان میں ان کی آمد اور آمد کے بعد سے موجودہ زندگی تک کے حالات و واقعات کا پُرکشش انداز میں احاطہ کیا ہے۔

طنز نگاری کے باب میں شاعری، ڈرامہ نگاری، ناول نگاری، روزنامچہ نگاری، تنقید نگاری، کالم نگاری اور انشائیہ نگاری کے اہم گوشوں کو تلاش کیا گیا ہے میرا ایسا خیال ہے کہ اس موضوع یعنی فکر تونسوی کی طنز نگاری پر اہم اور "نایاب مواد" کو ہمارے سامنے لایا گیا ہے۔

فارسی اور اردو میں طنز و مزاح کے اہم رُجحانات میں مختلف زمانوں کے اہم مزاح اور طنز نگاروں کے بارے میں بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ مقالے کے موضوع کے اعتبار سے یہ جائزہ بالکل سرسری ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کہ اس کا مقصد یہ تبلانا ہے کہ ان مزاح نگاروں کی نگارشات کے مقابلہ میں فکر تونسوی کا مقام کیا ہو سکتا ہے۔

فکر صاحب نے ابتداءً شاعری کا میدان اپنایا اور اس میں شروع ہی سے

اُن کی فکرِ سخن روایتی شاعری سے مختلف رہی۔ گو اُن کا ایک مختصر سا دیوان بھی شائع ہوا، مگر ان کی شاعری، ان کی دیگر اَدبی کاوشوں کے مقابلہ میں دریا میں قطرہ کے برابر سمجھی جا سکتی ہے۔ انھوں نے ڈرامہ نگاری، ناول نگاری اور تنقید نگاری بھی کی، مگر یہ اصناف ایسی ثابت نہ ہوئیں جو روزگار کے مسئلہ کو پوری طرح مکمل کر دیتیں۔ بالآخر، وہ اس مقام پر پہنچے جس سے اُن کے نام کو شہرتِ دوام حاصل ہو گئی ہے۔ میرا مطلب یہاں فکر صاحب کی کالم نگاری سے ہے۔ مقالے کے موضوع کے اعتبار سے بوگس صاحب نے فکر صاحب کے سب ہی اصنافِ ادب پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اب فکر صاحب اخبار "ملاپ" (دہلی۔ جالندھر۔ حیدرآباد۔ لندن) کے اِدارے سے وابستہ ہیں اور پچھلے ۲۵ برس سے مسلسل ہر روز اخبار کے ایک صفحہ کے چوتھائی حصّہ پر ان کا کالم "پیاز کے چھلکے" کے زیرِ عنوان منظرِ عام پر آتا ہے۔ فکر صاحب کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنا کالم لکھنے میں کبھی ناغہ نہیں کیا اور نہ ہی اُن کے کالم کا معیار کبھی گھٹا ہے۔ ایسا تو ضرور ہوتا ہے کہ کبھی تو یہ کالم بہت اعلیٰ اور لاجواب ہو جاتا ہے اور جب ایسا نہیں ہوتا تو اپنے سالہا سال کے معیار سے گرنے نہیں پاتا۔

فکر صاحب کی ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ ہر روز کوئی نیا موضوع، کوئی نیا زاویہ یا کوئی نئی بات تلاش کر لیتے ہیں اور اُس پر بے دھڑک اور بے ساختہ لکھ دیتے ہیں۔ وہ اُردو میں انگریزی، ہندی بلکہ پنجابی الفاظ بھی استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے، اور ان کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ وہ الفاظ جملوں میں اِس طرح فِٹ ہو جاتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینے، اور تحریر میں زیادہ لذّت پیدا ہو جاتی ہے۔

بوگس صاحب نے فکر صاحب کی شخصی زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ان کی نگارشات کی خوبیوں کی وضاحت میں مختلف نقادوں کی آراء بھی پیش کی ہیں۔ بوگس صاحب نے خود بھی فکر صاحب کو بار بار خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ آجکل ایم۔ اے میں مقالہ نگاری کا معیار کیا ہے، مگر مقالہ زیرِ بحث کی تکمیل میں جو محنت کی گئی ہے، وہ اس کے

ہر اعتبار سے مکمل ہونے کا ثبوت ہے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ جو حضرات اس مقالہ کو پڑھیں گے، ضرور پسند کریں گے اور اُن پر اِس کی افادیت واضح ہو جائے گی۔

(بھارت چند کھنہؔ)

۲۶ مارچ سنہ ۱۹۸۰

۶۸۔ بی ایسٹ مارڈ پلی
سکندر آباد



دانش ور بنتے بنتے نرگس! ہوا جب دستور طویل خط [illegible] جو اردو کا تھا۔ اب تو تم پر
ثابت ہو گیا۔ کہ تم نے عکاسی کے لئے غلط آدمی چنا۔ جس کی گذشتہ پچاس برس کی طرز پہ تحریریں
پر کسی نقاد نے ایک لفظ نہیں لکھا۔ جو کچھ لکھتا رہا، میں ہی لکھتا رہا۔ یعنی تخلیقی چیزیں، تنقید لکھنا
بلکہ لکھوانا ایک الگ آرٹ ہے جو کم از کم مجھے نہیں آتا۔ اور چونکہ نہیں آتا ہے۔ اس لئے میں نے
ڈائریکٹ قارئین کو ہی مخاطب کرنا بہتر سمجھا۔ اور قارئین نے میری تحریروں کو پسند کیا۔ میں
مطمئن ہو گیا۔ یار اگر قارئین اکثریت میں ہوتے ہیں، نقاد اقلیت میں۔ تمہارا کیا ارادہ؟

بھائی نرگس! سچ یہ تو یہ ہے۔ کہ کسی ادیب سے میری ذاتی دلچسپی عشق کی حد تک
نہیں رہی۔ اگرچہ سبھی مجھے جانتے ہیں، [illegible] میری تخلیق کو پسند کرتے ہیں یا نہیں اس
کے متعلق نہ انہوں نے کبھی بتایا۔ کرنے کی زحمت گوارا کی نہ میں نے ضرورت سمجھی۔ کیونکہ
مجھے تو صرف اظہار کا جنون تھا، ستائش کی تمنا تھی جا نہ کسی صلہ پہ باندھا تھا۔ گو اردو ادب
کے مورخ نے مجھے اس کی فرصت ہی نہیں دی۔ [illegible]

میرا
پہلا
اور آخری
بوگس
شاگرد!

بوگس حیدرآبادی کو مَیں ایک مُدت سے جانتا ہوں۔ بوگس، اپنی "بوگس شاعری" کی وجہ سے حیدرآباد ہی میں نہیں، حیدرآباد کے باہر بھی ایک جانا پہچانا نام بن چکا ہے۔ بوگس مختلف رسالوں میں بھی اپنی شاعری کے شگوفے کھِلاتا رہا ہے، اخبارات میں بھی چھپتا چھپاتا رہا ہے، پھر زندہ دلانِ حیدرآباد کے مشاعروں میں بھی اپنی صلاحیتوں کی داد پاتا رہا ہے۔ لیکن، سید نصیرالدین احمد سے مَیں واقف نہیں تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے ایوننگ کالج پر جب میرا تبادلہ ہُوا تو میں بوگس اور نصیر دونوں سے بیک وقت واقف ہوگیا۔ اُس وقت بوگس ایم۔ اے کر رہا تھا۔ ۷۴ء سے ۷۶ء تک مجھے ایک بوگس طالبِ علم سے سابقہ پڑا۔ مَیں نے دیکھا کہ نصیرالدین پر بوگس بُری طرح چھایا ہوا ہے۔ اس پورے عرصہ میں اور اس کے بعد بھی بوگس نے نصیرالدین کو کبھی سَر اُٹھانے نہیں دیا۔ بوگس اسمِ بامُسمّیٰ کی طرح تخلص بہ متخلص ہیں۔ اب آپ اس اصطلاح کو قبول کریں یا نہ کریں، زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ آپ اسے بوگس قرار دیں گے، اور یوں میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔

ایوننگ کالج میں بوگس کو قریب سے دیکھنے پر بوگس کی "صلاحیتوں وغیرہ" کا اندازہ ہُوا، جس میں صلاحیتوں کے ساتھ "وغیرہ" کا حصّہ کچھ کم تو کیا بلکہ زیادہ تھا۔ یعنی بوگس غیر طالبِ علمانہ سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا کرتا تھا۔ ان کو تکلفاً زاید از نصاب سرگرمیوں کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح بھی بالکل درست تھی لیکن اب کثرتِ استعمال سے کچھ کی کچھ ہوگئی ہے۔ اِصطلاح وضع کرنے والے نے بڑی نزاکت کے ساتھ یہی بات کہی تھی کہ نصاب سے زیادہ طالب علم ان سرگرمیوں میں سرگرداں رہتا ہے۔ لیکن اپنی عافیت اور طالب علموں کی خوشنودی کے لیے 'نصاب کے سوا' کا مفہوم زبردستی شامل کر دیا گیا ہے۔ بہرحال بوگس بھی ان سرگرمیوں میں بے حد مبتلا رہا۔ لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ طالبِ علمانہ سرگرمیوں سے وہ غافل تھا۔ وہ طالبِ علم کی حیثیت سے بڑا سنجیدہ مہذب اور شائستہ رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ بوگس کو میں نے اس زمانے میں ہر رنگ میں دیکھا۔ اس کے رنگ بدلتے بھی رہے۔ ان میں تبدیلی بھی آتی رہی، لیکن ہر حال میں بوگس، بوگس ہی رہا۔ بوگس کی یہ وضعداری قابلِ تعریف ہے اور قابلِ داد بھی ــــ بوگس کی "وغیرہ" والی مصروفیات میں ادبی رنگ ہمیشہ شامل رہا ہے۔ کالج میں بوگس نے اپنے چند ہم خیال دوستوں کے تعاون سے، مشاعرے، ادبی جلسے، شامِ افسانہ وغیرہ بڑے عظیم الشان پیمانے پر منعقد کیے۔ بوگس کی وجہ سے کالج میں واقعی بڑی ادبی ہماہمی رہی تھی۔ بوگس کی اس ادبی سرگرمی میں دوسروں کی پگڑی سنبھالنا اور اپنی پگڑی بندھوانا، یہ اور اس قسم کی ساری باتیں اس میں شامل ہُوا کرتی تھیں۔ یُوں کالج میں بوگس نے زندہ دلی کے ساتھ ایک ہنگامہ پر اپنی زندگی موقوف رکھی۔ اگر کسی موڑ پر بھی زندگی ہنگامہ پر موقوف ہوجائے تو اس سے بڑھ کر کیا بات ہوسکتی ہے۔

پھر یہ ہُوا کہ بوگس نے ایم۔ اے کے آخری سال کے پرچے کے بجائے مقالہ لکھنا پسند کیا۔ میری جو شامت آئی تو مَیں نے اس کا نگران بننا منظور کیا۔ منظور کیا، کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے بلکہ بوگس نے خود مجھ سے منظور کروالیا۔ جُوں ہی کالج کی تعطیلات شروع ہوئیں، بوگس اپنے دفتر سمیت شام ہی سے میرے سر پر مُسلّط

ہو جاتا، بڑی محنت اور جانفشانی سے مواد اکٹھا کرتا اور اس کی ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ پر غور کرواتا۔ یہ سلسلہ رات دیر گئے تک چلتا۔ یُوں مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ مواد کی فراہمی میں بوگس نے جو تگ و دَو کی ہے، اِس کا اندازہ مقالے کے پڑھنے کے بعد لگایا جا سکتا ہے۔ ویسے خود بوگس کے رنگ کو دیکھ کر آپ کو اس بات کا اندازہ کرنے میں دُشواری نہ ہونی چاہیئے۔ بوگس کا رنگ آج جو کچھ بھی ہے اِس کا سَبب اِس کا یہی مقالہ ہے۔ شدید دھوپ اور گرمی میں بوگس نے اپنے مواد کے لیے نہ صرف حیدرآباد کے کُتب خانوں کو کھنگالا ہے بلکہ حیدرآباد کے باہر بھی وہ جہاں کہیں گیا ہے اُس پر فکر کی فکر غالب رہی ہے۔ اس سلسلہ میں خود فکر کی فکر کو کس قدر پریشاں اور پراگندہ کیا گیا، اس کا اندازہ خود فکر کو ہوگا لیکن فکر کی فکر کے احاطے میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ان کی فکر کی اتنی جولان گاہیں ہیں۔ بوگس کے مقالے کو دیکھ کر اُنھیں یہ معلوم ہو سکا کہ اِن کی فکر کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ ورنہ فکر اپنی فکر کے دَوران میں اپنے بہت سے افکار کو بھُول گئے تھے بوگس نے فکر ہی کو نہیں اُردو دنیا کو بھی یاد دلایا کہ فکر کی فکر کو صرف طَنز ہی تک محدُود کر دینا، اس کی فکر کا کچھ سچّا اور اچھا اعتراف نہیں ہے۔ بوگس نے بڑی کھوج کر کے بڑی جُستجو کے ساتھ فکر کے سارے اَدبی کارناموں کو سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ فکر کی کتابیں حتیٰ کہ اُن کا مجموعۂ کلام تک اُن کے پاس نہیں ہے۔ لیکن بوگس نے اِن کی تمام تر کتابوں اور ادبی کاوشوں کو اکٹھا کرنے کی اور اِن کی اَدبی قدر و قیمت کو متعین کرنے کی سعیِ بلیغ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فکر کے کارناموں کا کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں ہے جو بوگس کی فکر کے احاطہ میں نہ آیا ہو۔ فکر نے مختلف ادبی میدانوں میں جو شہسواری کی ہے، آج لوگ اُس سے قطعی ناواقف ہیں۔ آج فکر کو صرف طَنز نگار ہی سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کی یہ حیثیت سب سے نمایاں اعلیٰ اور اَرفع ہے۔ لیکن فکر کے ادب کے 'دریائے بے تابی' میں کیسی کیسی "موجِ خوُں" اُبھرتی رہی ہیں' اِس کا حساب وکتاب نہ رکھنا بڑی بے اَدبی کی بات ہوتی۔ مجھے خوشی ہے کہ بوگس سے یہ بے اَدبی سَرزد نہیں ہوی، بلکہ اس نے اپنے مقالے میں ان تمام باتوں کا ذکر کر کے اپنی فکر شناسی کا ثبوت دیا ہے۔

اِس مقالے میں فکر کی ناول نگاری، رسالوں کی ادارت غرض کہ کوئی پہلو بھی ایسا نہیں ہے جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بوگس کو، خواہ کتنا ہی بوگس کیوں نہ قرار دیں، اُس کی اس ادبی اور تحقیقی کوشش وکاوش کو 'بوگس' قرار دینے کی جُرأت نہیں کر سکیں گے۔ بوگس کو اس کتاب کی اشاعت پر مَیں مبارکباد دیتا ہوں۔ اس بات کی اُمید ہے دوسرے بھی اس کے اس فکرانگیز تحقیقی کام کو تحسین کی نظر سے دیکھیں گے اور مجھے بھی اپنی محنت کے چیز ہونے کا احساس ہوگا۔ کیونکہ غالب نے اپنے شاگرد تُفتہ کے بارے میں جو بات کہی تھی وہ یہاں بھی صادق آتی ہے، یعنی اُس کی شہرت میں میری بھی نام وری ہے۔

یوسف سرمست
ریڈر شعبۂ اُردو، جامعہ عثمانیہ
(حیدرآباد ایوننگ کالج)

طنز کیا چیز ہے

تنقید کے متعلق ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا کہ "تنقید انسان کے لیے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی کہ سانس" تنقید کا جذبہ انسانی جذبات میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اصل میں طنز و مزاح اسی بنیادی جذبہ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ طنز و مزاح بنیادی طور پر تنقید ہی کا دوسرا نام ہے۔ تنقید کا بنیادی اور اہم خیال پرکھنا۔ جانچنا، حکم لگانا، فیصلہ کرنا ہے اور تنقید بھی قدر و قیمت متعین کرتی ہے۔ تنقید اس طرح سے حسن و قبح دونوں کو سامنے لاتی ہے۔ حسن کے لیے تحسین اور قبح کے لیے تنقید سے کام لیا جاتا ہے۔ طنز و ظرافت میں بھی تحسین و تنقیدیں دونوں ہی ملتے ہیں۔ لیکن ان دونوں پر پردے ہی پڑے رہتے ہیں۔ طنز کے ذریعہ اچھائی کے معیار کو سامنے رکھ کر برائی پر طنز کیا جاتا ہے اور مزاح یا ظرافت میں بھی ان چیزوں کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے جو معیار سے گری ہوئی ہوتی ہیں طنز اور مزاح دونوں بھی جانچ اور پرکھنے کا عمل پوری شدت سے جاری

رہتا ہے لیکن فرق یہ ہوتا ہے کہ حُسن کی تحسین کیسے بغیر قبح کی تنقیدیں اس طرح کی جاتی ہیں اور قبح کی اہمیت خود بہ خود واضح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ قبح یا برائی شر یا بدی کی تنقیدیں ہوتی ہیں۔

کسی نے یہ بات بالکل صحیح کہی ہے کہ ہر انسان طنز و مزاح سے کام لیتا ہے۔ ہر عمر میں کام لیتا ہے۔ مدرسہ کا وہ بچہ جو اپنے استاد کے بارے میں چند بے تکے جملے کہتا ہے وہ بھی اصل میں طنز و مزاح سے کام لیتا ہے آپ ہم جو مختلف چیزوں پر طنز کرتے ہیں یا ان کی ہنسی یا مضحکہ اڑاتے ہیں وہ بھی ظاہر ہے کہ طنز و مزاح میں داخل ہے۔ لیکن عام انسان میں اور طنز و مزاح نگار میں جو بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ طنز نگار اور مزاح نگار تنقیدی جذبہ کو ایسا خوش گوار دلاویز روپ دیتا ہے اور اس میں یہ لذت پیدا کرتا ہے جس کو پڑھ کر سن کر ہم نہ صرف اس کی "تقریر کی لذت" سے مسحور ہو جاتے ہیں بلکہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ گویا یہ بھی ہمارے دل ہی کی بات ہے۔

طنز و مزاح نگار بنیادی طور پر "مصلح" ہوتے ہیں جس طرح ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ بھی طنز اور مزاح کی جانب راغب کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر اچھے اور کار آمد حربہ کی طرح اس کا بھی استعمال کبھی غلط طور پر کیا جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس سے حربہ یا ہتیار پر حرف نہیں آتا، اس کے استعمال کرنے والے کو طنز اور مزاح کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

ادب میں بھی طنز و ظرافت کی اہمیت اسی وجہ سے ہے کہ اس کا محرک ایک بلند اور شریفانہ احساس ہوا کرتا ہے۔ ادب کی اور اصناف کی طرح طنز و ظرافت کی بھی بے حد اہمیت ہے۔ لیکن شاید یہ اردو ادب کی

ایک طرح سے بدقسمتی رہی ہے کہ جس طرح سے انگریزی ادب میں انگریزی اور مغرب کی دوسری زبانوں میں طنز و ظرافت کو جو مستقل مقام اور حیثیت حاصل ہے اور جس کا ذکر اور اصناف ادب ساتھ ہوتا ہے۔ اردو میں طنز و ظرافت کو ویسا مستقل اور امتیازی مقام اب تک حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اُردو ادب میں طنز و مزاح کا وافر ذخیرہ ہے اور یہ ذخیرہ ایسا ہے جس کے بارے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ

> "اس میں شک نہیں کہ اگر طنزیات و مضحکات کے متن دانشار و ادب کو ہندوستان میں کبھی ایسا فروغ نصیب ہوا جو دیگر مکمل اور ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ میں قابل اعتبار و اعتناء ہو تو اس کی حامل یقیناً اردو ہو گی۔"

("طنزیات و مضحکات" از پروفیسر رشید احمد ص ۸)

اُردو ادب میں گو طنز و مزاح کی طرف کسی قدر توجہ کی جا رہی ہے اور گذشتہ چند برسوں میں اس پر مستقل کام بھی ہوا ہے۔ لیکن اُردو ادب کی مختلف تاریخوں میں طنز و مزاح کے بارے میں ابھی جیسا کہ چاہیے مواد جمع نہیں ہوا اس لیے طنز و مزاح کیا ہے یا طنز و مزاح کی کیا تعریف ہو سکتی ہے اور اس بارے میں اُردو کے عالم و نقاد ایک حد تک خاموش ہیں یہی وجہ ہے کہ طنز و مزاح کے فرق اور اس کی تعریف کرنے کے لیے ہمیں مغربی معیار کو اور مغربی پیمانوں کو سامنے رکھنا لازمی اور ناگزیر ہو جاتا ہے۔

ہر صنفِ ادب کی طرح طنز و مزاح کی بھی جامع اور مانع تعریف کرنا محال ہے بلکہ مشکل ہے حالانکہ طنز و مزاح کیا ہے یہ سب جانتے ہیں لیکن اس جانکاری کو الفاظ کے محدود پیمانے میں بیان کرنا مشکل ہے۔ کسی شاعر نے شاعری کے بارے میں بڑے پتے کی بات کہی تھی وہ یہ کہ اگر تم مجھ سے یہ پوچھو کہ شاعری کیا ہے تو میں جانتا ہوں کہ وہ کیا ہے۔ لیکن تم اگر پوچھوگے کہ وہ کیا ہے تو میرا جواب یہ ہوگا کہ میں نہیں جانتا۔ اسی طرح روح بھی ہر جاندار میں موجود ہوتی ہے جس سے اس کی زندگی اور حیات کا اندازہ ہوتا ہے لیکن اگر کوئی یہ دریافت کر بیٹھے کہ روح کیسی ہوتی ہے اور اس کی ماہیت کیا ہے تو جواب آپ جانتے ہیں کہ کیا ہو سکتا ہے۔ یہی بات طنز و مزاح کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود طنز و مزاح کی تعریف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر جانسن کے نزدیک "طنز کسی حماقت یا برائی کو ختم کرنے یا رد کرنے کا نام ہے۔" سویفٹ کے نزدیک "طنز ایک ایسا آئینہ ہے جس میں سوائے اپنے سب کی کمزوریاں دیکھی جا سکتی ہیں"۔ سویفٹ نے ایک دوسری جگہ "طنز کو ایک ایسی اخلاقی پولیس کہا ہے۔ جو برائی کے سامنے بے بس ہے لیکن اچھائی کی مددگار ہے۔ رچسٹرٹن کا کہنا ہے کہ ایک سور کو اس سے بھی زیادہ مکروہ شکل میں پیش کرنا جیسا کہ خود خدا نے اس کو بنایا ہے۔ طنز یا تضحیک (سٹائیر ہے) آرتھر کوسلیر کے مطابق " طنز جانی بوجھی چیزوں کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کرنے کا نام ہے۔" وہ اس کی توضیح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"ہمارے اذہان زندگی کی بیزار کن یکسانیت اور بیرنگ تکرار سے اس قدر بے حس ہو چکے ہیں اور ہم زندگی کے ناسوروں کو دیکھ کر اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ جب تک طنز نگار مبالغے کے انداز میں پیش نہ کرے ہماری نگاہیں جمنے ہی نہیں پاتیں۔"

("اردو ادب میں طنز و مزاح" ——— ڈاکٹر وزیر آغا۔ صفحہ ۵۸)

طنز یا سٹائیر کی تعریف انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں یوں کی گئی ہے۔

"ہجو یا ہجا (طنزیات کے مفہوم میں) کا مقصد یہ ہے کہ کسی بے ہنگام یا مضحکہ خیز واقعہ یا حالت پر ہمارے جذبۂ تفریح یا تفریحات کو تحریک ہو بشرطیکہ اس ہجو طنز میں ظرافت یا خوش طبعی کا عنصر نمایاں ہو اور اسے ادبی حیثیت بھی حاصل ہو، اگر ان حیثیتوں کا فقدان ہوا تو پھر یہ گالی گلوچ یا ..... دہقانیوں کی طرح منہ چڑھانا ہوگا۔

("طنزیات و مضحکات" از رشید احمد صدیقی)

طنز کی مذکورہ بالا تعریف سے یہ بات صاف طور پر نمایاں ہوتی ہے کہ طنز کا لازمی اور ناگزیر عنصر مزاح ہوا کرتا ہے اور اسی وجہ سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ طنز بغیر مزاح کے گالی بن جاتا ہے۔ پھر ایک اور شرط طنز کے لیے یہ بھی ضروری قرار دی گئی ہے کہ اس میں ادبیت بھی ہو۔ بغیر ادبی رنگ و روپ کے طنز، طنز نہیں ہوتا اور طنز میں ادبیت اس وقت نمایاں

ہو سکتی ہے جب کہ طنز و مزاح نگار کو زبان و بیان پر پوری طرح قابو حاصل ہو۔ طنز کے سلسلہ میں مذکورہ بالا تعریف سے ایک اور بات کی وضاحت یہ بھی ہوتی ہے کہ طنز در اصل وجود میں اس لیے آتا ہے کہ اس کا محرک اصلاح کا جذبہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے بے ہنگام یا مضحکہ خیز واقعہ یا حالت پر طنز کیا جاتا ہے۔

اصل میں اُردو میں طنز سٹائر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن سٹائر کے لفظ میں جو وسعت اور معنویت ہے وہ طنز کے لفظ سے پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ اسی لئے پروفیسر رشید احمد صدیقی لفظ سٹائر کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

> "سٹائر کا جو مفہوم جو انگریزی ادب میں ہے اس کی پوری اور صحیح ترجمانی ہمارے یہاں کے کسی ایک لفظ میں تقریباً ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اس موقع پر چند الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً ہجو، ہجا، ہجو ملیح، تعریض، تنقیص، لعن و طعن، طنز، استہزا، مذمت، مضحکات شطیحات، ہجو، ہزل وغیرہ۔"

(طنزیات و مضحکات از رشید احمد صدیقی)

سٹائر اس طرح بے حد وسیع معنی رکھتا ہے اور اردو میں بھی اگرچہ کہ طنز سے سٹائر کا پوری طرح مفہوم ادا نہیں ہوتا لیکن چونکہ یہ لفظ سٹائر کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے اس میں وہی وسعت پیدا ہوتی ہے جو انگریزی لفظ سٹائر میں ہے۔

مزاح کیا ہے

انسان خوشی اور مسرت کا جویا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے جگر نے کہا تھا کہ "مسرت زندگی کا دوسرا نام ہے" لیکن مسرت کی تمنا بھی جگر کے کہنے کے مطابق مستقل غم بن جاتی ہے۔ انسان کی زندگی کی ساری تگ و دو سچ پوچھیے تو صرف مسرت اور خوشی حاصل کرنے کے لیے ہوا کرتی ہے۔ ہر قسم کی خوشی انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کے حصہ میں آجائے۔ فرائیڈ کے کہنے کے مطابق انسان کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ الم سے محفوظ رہے، غم سے بچے اور مسرت یا خوشی کو حاصل کرے، خوشی اور مسرت انسانی زندگی میں ایک طرح سے ناقابلِ حصول ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ انسان کی زندگی دونوں کے درمیان کا وقفہ ہے ایک غم تو اس کے ہونے کا ہے۔ اور دوسرا غم اس کے نہ ہونے کا۔ استاذِ محترم ڈاکٹر یوسف سرمست کے مطابق:"

> مزاح یا خوشی زندگی کی حقیقت نہیں زندگی سے فرار کا ایک راستہ ہے۔ انسانی زندگی کی حقیقت کی ٹریجڈی موت ہے۔ یہ اتنی مستقل اور اتنی مستحکم حقیقت ہے کہ جس سے کہیں بھی اور کسی طرح بھی مفر نہیں ہے۔ انسان کی زندگی آغاز سے انتہا تک غم کی پرچھائیوں سے مملو ہوتی ہے۔ انسان روتا ہوا آتا ہے اور رلاتا ہوا جاتا ہے۔ حد درجہ خوشی میں بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ انسانی زندگی میں غم کا یہ استقلال صرف مسرت کو اہمیت ہی نہیں دیتا خود اسے زندگی بنا دیتا ہے۔"

(نگار نیا زنمبر مضمون ڈاکٹر یوسف سرمست ص۱۷۱)

یہی وجہ ہے کہ بعض اہم اور مشہور قنوطی فلسفی زندگی میں غم اور یاس کو اہمیت دیتے ہیں۔ شوپنہاور کے کہنے کے مطابق "یہاں ہونے کی اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنا نہ ہونے کا غم" گویا غم ایک مثبت حقیقت ہے جبکہ خوشی منفی حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں کی سچائی ہی جہاں ایک طرف غم کی زندگی میں جو اہمیت ہے اس کی وضاحت کرتی ہے تو دوسری طرف خوشی کی بھی انسانی زندگی میں جو اہمیت ہے اس کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ خوشی منفی حقیقت ہو یا کہ زندگی کی حقیقتوں سے فرار کا دوسرا نام ہے۔ بہر حال انسانی زندگی میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

غم انسانی زندگی میں جس طرح چھایا رہتا ہے اور انسانی غم کی انتہا موت کی حقیقت جس طرح کسی نہ کسی صورت میں ثابت ہوتی ہے۔ وہی حقیقت مزاح کو اگر چیکہ ثانوی حیثیت دے دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مزاح کو ادب میں بھی ہمیشہ ثانوی حیثیت حاصل رہی ہے۔ لیکن یہی ثانوی حیثیت انسان کے لیے سب سے مقدم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے سب سے مقدم بن جاتی ہے اسی لیے انسان تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی غم سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔

انسان ہی تنہا ایسا جانور ہے جو ہنس سکتا ہے۔ اسی وجہ سے انسان کو حیوان سے ممیز کرنے والی چیز اس کی یہی ظرافت ہوتی ہے۔ اس لیے انسان کو جہاں سماجی حیوان کہا گیا ہے "حیوان ناطق کہا گیا وہیں اسے بجا طور پر حیوان ظریف کہا گیا ہے۔ گویا خود ظرافت ہی انسان کو انسان بنائے رکھتی ہے۔ اس لیے اگر انسان سے اس کا یہ وصف چھین لیا جائے تو گویا اس

کی انسانیت میں کمی آجاتی ہے۔ لیکن ہنسی بذات خود کیا ہے۔ یہ بتانا یا کہنا دشوار ہے کہ ہنسی بذات خود کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ خوشی کے اظہار کا دوسرا نام ہے۔ جس طرح آنسو کی کوئی حقیقت نہیں ہے سوائے چند قطرے پانی کے لیکن یہ چند قطرے غم کو ظاہر کرنے کی سب سے مستحکم علامت ہوا کرتے ہیں اسی طرح ہنسی بھی خوشی کو ظاہر کرتی ہے۔ یہی وہ وجہ ہے کہ ہنسی کی کی تعریف کرنے میں اختلاف رہا ہے اور طرح طرح سے اس کی تعبیر کی گئی ہے اور ان تاویلات پہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ کیونکہ یہ ہنسی کو بھی مضحکہ خیز بنا دیتی ہے اور یہی مضحک پہلو ہنسی کا دراصل باعث ہوتا ہے۔ آیئے تھوڑی دیر ہنسی کی ہنسی اڑائیں۔ چارلس ڈارون ہنسی کا جو نظریہ پیش کرتا ہے وہ خود مضحکہ خیز ہے۔ اس کے مضحکہ خیز نظریہ کو ملاحظہ فرمایئے

"ہنسی کے دوران میں منہ پھیل جاتا ہے اور ہونٹوں کے
کنارے اور اوپر کی طرف ہٹ جاتے ہیں۔ اس
طرح اوپر والا ہونٹ قدرے اور اوپر اٹھ جاتا ہے اور
شدید ہنسی کے دوران میں تو سارا جسم کانپنے لگتا ہے
سانس میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے اور آنسو نکلنے
لگتے ہیں"

"ایکس پریشن آف ایموشنس" از چارلس ڈارون" ص ۲۰۸ و ۲۱۴ ہنسی کی ڈارون نے جو تصویر کھینچی ہے اس کو تصور میں لایئے اور دیکھئے ہنسی کیسی مضحکہ خیز چیز ہے۔

جمیما موائی ٹی گریگ کا کہنا ہے کہ۔

" دروازے پر سے چھلانگ لگانے یا بندوق کی لبلبی دبانے

سے ذرا قبل آپ ایک لمبا سانس لیتے ہیں اور پھر سے اپنے سینے میں روک کے رکھتے ہیں۔ ہنسی کے وقت بھی اسی طرح ایک لمبا سانس لیتے ہیں مگر اسے روکنے کے بجائے آپ اسے آواز کے چھوٹے چھوٹے دھماکوں کی صورت میں خارج کر دیتے ہیں۔"

("اردو ادب میں طنز و مزاح" از ڈاکٹر وزیر آغا)

آرتھر کوئسلر کے نزدیک ہنسی ایک خاص عضویاتی مظاہرہ ہے وہ ہنسی اور خوشی میں تفریق کرتے ہوئے اس کی وضاحت یوں کرتا ہے:

"خیالات و احساسات ایک خوب صورت تصویر کو دیکھ کر یا ایک اعلیٰ نظم کو پڑھ کر دل میں ضرور متحرک ہوتے ہیں لیکن ایسا خاص عضویاتی مظاہرہ نہیں ہوتا جو ہنسی کے وقت معرضِ وجود میں آتا ہے اور یہ چیز محض ہنسی سے مخصوص ہے کہ انسان ایک لطیفہ کو سن کر یا پڑھ کر اپنے جذبات و احساسات کا اتنے نمایاں انداز میں اظہار کرتا ہے۔"

("ان سائٹ اینڈ آوٹ لوک" از آرتھر کوئسلر ص - ۳۰۴)

آرتھر کوئسلر کے کہنے کے مطابق خوشی کے عضویاتی مظاہرہ کا نام ہنسی ہے اس طرح سے ہنسی میں جو خوشی چھپی ہوئی ہے اس کو مختلف طریقوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اور خوشی کا محرک اصل میں مزاح ہوا کرتا ہے اور مزاح کے ڈانڈے عام طور پر طنز سے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہنسی کی فلسفیانہ موشگافیاں کی جاتی ہیں تو مزاح

اور طنز کے مختلف پہلو سامنے آنے لگتے ہیں۔ آیئے ہنسی خوشی سے مزاح اور مزاح سے طنز کا جو سفر ہوتا ہے اس کو فلسفہ کی عینک سے دیکھنے کی کوشش کریں۔

معلّم اول ارسطو نے بھی ہنسی کی توضیح و تشریح کی ہے اور اس کے کہنے کے مطابق "ہنسی کسی ایسی کمی یا بدصورتی کو دیکھ کر معرضِ وجود میں آتی ہے جو درد انگیز نہ ہو۔" گویا طنز جہاں سے پیدا ہوتا ہے وہیں سے ہنسی بھی پیدا ہوتی ہے۔ طنز کا نشانہ بھی کوئی کمی یا بدصورتی ہوا کرتی ہے یہ بدصورتی خواہ کسی بھی حالت میں ہو، خواہ سماج میں ہو، انسان میں ہو، ادب میں ہو، تصویر میں ہو، موسیقی میں ہو یا کسی اور شے میں۔

ہابس نے ہنسی کے تعلق سے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کو ملاحظہ کیجئے

"ہنسی کچھ نہیں سوائے اس جذبہ افتخار یا احساس برتری کے جو دوسروں کی کمزوری یا اپنی گذشتہ خامیوں کے باعث معرضِ وجود میں آتی ہے۔"

("ہیومن نیچر اِن ورکس" از ہابس۔ طبع ۱۸۴۰ء جلد دوم)

ہابس کے اس نظریہ ہنسی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بدصورتی اور کمی ہنسی کا باعث بنتی ہے۔ گویا چیزوں کی مضحکہ خیزی ہنسی پیدا کرتی ہے۔ اس طرح سے ہنسی کا تعلق خوشی سے نہیں ہوتا مسرت سے نہیں ہوتا بلکہ صرف طنز سے ہوا کرتا ہے۔ لیکن مسرت اور خوشی ہنسی سے الگ اپنا وجود رکھتے ہیں اور ہنسی کا تعلق یوں مضحکہ خیزی اور طنز سے ہی قائم ہو جاتا ہے۔

کانٹ نے بھی ہنسی کی جو تعریف کی ہے وہ بھی دراصل طنز اور مزاح کی طرف ذہن کو لے جاتی ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق۔

"ہنسی اس وقت نمودار ہوتی ہے۔ جب کوئی چیز ہوتے ہوتے رہ جائے اور ہماری توقعات اچانک ایک بلبلہ کی طرح پھٹ کر ختم ہو جائے۔"

(اردو ادب میں طنز و مزاح"۔ از ڈاکٹر وزیر آغا کریٹی سیریم آف جج منٹ ص ۲۲۳)

کانٹ نے ہنسی کی جو تعریف کی وہ بہ یک وقت ہنسی اور غم دونوں ہی پر صادق آسکتی ہے۔ توقعات کا یکایک ختم ہو جانا یا کسی امید کا ٹوٹ جانا درد انگیزی کا باعث ہو سکتا ہے۔ غم کا باعث ہو سکتا ہے اور ہنسی کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں بھی غور کیجیے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ہنسی کا تعلق طنز سے پیدا ہوتا ہے اور یہ ہنسی وہ ہنسی نہیں ہے جو خوشی کا اظہار ہے بلکہ یہ ہنسی دردمندی کا دوسرا نام ہے یا یہ کہ کسی چیز یا بات کی مضحکہ خیزی کی علامت ہے۔ اسی طرح شوپنہاور نے ہنسی کی جو تعریف کی ہے۔ وہ بھی ذہن کو طنز و مزاح کی جانب لے جاتی ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق "ہنسی تخیل اور حقیقت کے مابین ناہمواری کے وجود کو اچانک محسوس کر لینے سے جنم لیتی ہے۔

اب تک ہنسی کی جتنی بھی تعریفیں ہوئی ہیں، وہ سب طنز و مزاح کی طرف ذہن کو لے جاتی ہیں۔ اصل میں ہنسی اور مزاح کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہنسی کی تعریف مزاح کی تعریف ہے اور مزاح کی تعریف ہنسی کی تعریف ہے۔ اسٹیفن لی کاک نے مزاح کی حسب ذیل تعریف کی ہے۔ مزاح کیا ہے

یہ زندگی کی اس ناہمواری اور شعور کا نام ہے۔ جن کا فن کارانہ اظہار ہو جائے۔ اسٹیفن لیکاک کا یہ بیان اصل میں ارسطو کے نظریہ ہنسی کی آواز بازگشت ہے۔ ہنسی کے تعلق سے جتنے نظریئے ملتے ہیں ان میں مضحکہ خیزی کے پہلو کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ارسطو سے لے کر اسٹیفن لیکاک تک سب ہی زندگی کی مختلف مضحکہ خیز پہلوؤں کو ہی ہنسی یا مزاح گردانتے ہیں ارسطو درد انگیز نہ ہونے کو ہنسی کا باعث قرار دیتا ہے۔ اور اسٹیفن لیکاک نے اسے "شعور کا ہمدردانہ اظہار" کہا ہے حالانکہ مزاح کے لیے یا طنز کے لیے ہمدردانہ شعور کی ہر جگہ ضرورت نہیں ہوتی۔ ہنسی اڑانا یا یہ کہ کسی چیز کو مزاحیہ بنا کر پیش کرنے کا محرک غم و غصہ کا جذبہ بھی ہوا کرتا ہے۔

غم و غصہ کا وہ جذبہ جو نفرت میں تبدیل ہو جاتا ہے وہ بھی انسان کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ جس چیز سے نفرت کر رہا ہے یا جس کے تعلق سے وہ غم و غصہ کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت بھی ہنسی اڑائی جاتی ہے۔ مضحکہ اڑایا جاتا ہے طنز کیا جاتا ہے اور مزاحیہ انداز میں چیزوں کو پیش کیا جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طنز و مزاح کا بنیادی جذبہ کسی چیز کو بدلنے یا تبدیل کرنے کی خواہش کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی اور تغیر کی خواہش ہی انسان کو طنز اور مزاح کے نشتر چلانے پر مجبور کرتی ہے اور تبدیلی و تغیر کی یہ خواہش لازمی طور پر ہمدردانہ نہیں ہوتی بلکہ اکثر صورتوں میں معاندانہ بھی ہو سکتی ہے اور متعصبانہ بھی ہو سکتی ہے۔

ہنسی اور مزاح کے تعلق سے پروفیسر کلیم الدین احمد کا نقطہ نظر زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی عدم تکمیل اور بے ڈھنگے پن کو ہنسی کا

محرک قرار دیتے ہیں اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ہنسی عدم تکمیل اور بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے جس دنیا میں ہم سانس لیتے ہیں وہ تکمیل سے خالی ہے انسان اور انسانی فطرت میں بھی ناتمامی ہے اس لیے ہنسی کے مواقع کم نہیں۔ دنیا اور زندگی کی ناتمامی اور ناموزونیت سقم ہے۔ ہم محض ایسی ناتمامی کا احساس کر سکتے ہیں یا اس احساس کے ساتھ اس نقص کو دور کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

(سخن ہائے گفتنی۔ از کلیم الدین احمد ص۵۲)

کلیم الدین احمد کے اس نظریہ میں بھی اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ ہنسی یا مزاح کے جذبہ کے پیچھے کون سا شعور کام کرتا ہے۔ ہماری اپنی ناقص رائے میں جیسا کہ اس سے پہلے بھی ظاہر کیا جا چکا ہے کہ "ضروری نہیں کہ صرف ہمدردانہ شعور ہی کام کرے بلکہ مخالفانہ اور غیر ہمدردانہ شعور بھی طنز و مزاح کا محرک ہوا کرتا ہے۔ البتہ کلیم الدین احمد کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ ناتمامی کا احساس عدم تکمیل اور بے ڈھنگے پن کا احساس ایسی بنیاد ہے جو دوسرے احساس کو پیدا کرنے والا ہوتا ہے یعنی اس کمی ناتمامی کو دور کا احساس۔ ناتمامی کے احساس اور اس نقص کو دور کرنے کی کوشش کے اس احساس کو دور کرنے کے تعلق سے پروفیسر کلیم الدین احمد لکھتے ہیں۔

"یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں، دوسرے احساس سے پہلے

احساس کا وجود ضروری ہے۔ لیکن پہلے احساس کے ساتھ
دوسرے احساس کا وجود لازمی نہیں ہے۔ پہلے قسم کے
احساس کا نتیجہ خالص ظرافت ہے۔ دوسرے کا نتیجہ
طنز اور ہجو۔ خالص ظرافت نگار کسی بے ڈھنگی چیز کو
دیکھ کر ہنستا ہے۔ اور دوسروں کو ہنساتا ہے۔ وہ اس
نقص خامی بدصورتی کو دور کرنے کا خواہش مند نہیں۔
ہجو گو اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور تقریباً
خامی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
(سخن ہائے گفتنی۔ از کلیم الدین ص ۱۹۲ تا ۱۹۳)

لیکن یہاں بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ مزاح نگار کا مقصد صرف ہنسنا ہنسانا ہوتا ہے اور اس کے پیچھے کوئی تعمیری جذبہ کام نہیں کرتا یا یہ کہ وہ کسی نقص کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ صرف اس کی ہنسی اڑاتا ہے۔ اصل میں طنز اور مزاح میں تفریق کرنا بے حد مشکل ہے۔ درحقیقت مزاح اور طنز ایک دوسرے سے ایسے پیوست ہیں کہ ایک دوسرے کو جدا کرنا حقیقتاً موشگافی کے مترادف ہے یا یہ ایسی کوشش ہے کہ جس طرح جڑواں بچوں کو علیحدہ تو کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ علیحدگی سے حاصل کچھ نہیں۔ کیونکہ اس کوشش میں دونوں کا ختم ہوجانا یقینی ہے۔ اس لیے کہ ایک کی حیات دوسرے سے وابستہ ہے اکثر مفکرین نے طنز اور مزاح کو الگ کرنے اور ان کے الگ ہونے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے رونالڈ نیا لکس کا خیال ہے کہ:

"مزاح نگار خرگوش کے ساتھ بھاگتا ہے اور طنز نگار

کُتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے۔"

(ایس سے آن سٹائرازرونالڈ ناکس)

گویا طنز نگار تعمیری کام کرتا ہے۔ اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ جب کہ مزاح نگار بے مقصد طور پر صرف ہنستا ہنساتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بغیر تعمیری جذبہ کے نہ اعلیٰ مزاح پیدا ہو سکتا ہے اور نہ اعلیٰ درجہ کا طنز" بلکہ وہ مزاح جس میں کوئی مقصد نہ ہو، جس کا محرک کوئی تعمیری جذبہ نہ ہو، اسے صرف "مسخر گی" کہنا بہتر ہے۔ مسخرگی کو مزاح سے تعبیر کرنا مزاح کی توہین ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا طنز و مزاح کے فرق کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"طنز زندگی اور ماحول سے برہمی کا نتیجہ ہے اور اس میں غالب عنصر نشتریت کا ہوتا ہے۔ طنز نگار جس چیز پہ ہنستا ہے اس سے نفرت کرتا ہے اور اسے تبدیل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف مزاح زندگی اور ماحول سے انس اور مفاہمت کی پیداوار ہے۔ مزاح نگار جس چیز پر ہنستا ہے اس سے محبت کرتا ہے اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لینا چاہتا ہے۔ طنز نگار توڑتا ہے اور توڑنے کے دوران میں ایک قہقہہ لگاتا ہے۔ چنانچہ طنز میں جذبہ افتخار کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود رہتا ہے اور دوسری طرف مزاح نگار اپنی ہنسی سے ٹوٹے ہوئے تار کو جوڑتا ہے۔ اور بڑے پیار سے ناہمواریوں کو تھپکنے

لگتا ہے۔

("اردو ادب میں طنز و مزاح" از ڈاکٹر وزیر آغا)

ڈاکٹر وزیر آغا نے طنز کی بنیاد نفرت کے جذبہ کو قرار دی ہے گویا طنز نگار جس پر طنز کرتا ہے اس سے صرف نفرت کرتا ہے۔ حالانکہ طنز نگاری کا محرک بھی لازمی طور پر نفرت کا جذبہ نہیں ہوتا بلکہ اکثر صورتوں میں طنز نگاری کے پیچھے ہمدردی کا جذبہ کارفرما ہوا کرتا ہے۔ طنز نگار چیزوں کو بدلنا چاہتا ہے۔ تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ صرف توڑنا پھوڑنا ہی اس کا مقصد نہیں ہوتا، وہ توڑتا پھوڑتا اس لیے ہے کہ وہ اس سے بہتر چیز کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اس توڑ پھوڑ کے پیچھے تعمیر کا جذبہ اپنی پوری شدّت سے کارفرما نظر آتا ہے۔ نہ کہ صرف تخریب پسندی مزاح کے پیچھے بھی صرف یہ کہنا کہ محبت اور ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے کچھ زیادہ صحیح معلوم نہیں ہوتا بلکہ مزاح کے پیچھے بھی بعض وقت نفرت کا جذبہ کام کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ نفرت ہنسی دل لگی میں ایسی ملفوف ہوتی ہے کہ اس کو فوراً محسوس کر لینا ..... ممکن نہیں ہوتا۔ مزاح کے پیچھے بھی عام طور پر طنز نگاری کا جذبہ چھپا ہوتا ہے۔ اس لیے شاید پروفیسر رشید احمد صدیقی ظرافت کے لیے طنز کو ضروری سمجھتے ہیں اور طنز کے بارے میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ جو مزاح سے پاک ہو سکتا ہے وہ لکھتے ہیں:

" ظرافت میں طنز مضمر ہوتا ہے۔ طنز میں ظرافت کا دخل
نہیں ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک ظرافت طنز سے مشکل
فن ہے۔ ظرافت کے لیے خوش دلی اور زحمت درکار
ہوتی ہے۔ طنز میں جوش و غصہ اور بیزاری کی کارفرمائی

ہوتی ہے ۔"

(علی گڑھ میگزین مضمون رشید احمد صدیقی مارچ ۴۲ء ص ۱۴)

میرا اپنا خیال ہے کہ طنز وہ کونین ہے جو مزاح کی شکر میں لپیٹ کر دی جاتی ہے۔ کھانے والا شکر کے شوق میں اور اس کی مٹھاس میں یعنی مزاح کے شوق میں طنز کی کونین بڑے شوق سے نگل جاتا ہے۔ اس طرح سے طنز زیادہ کارگر بن جاتا ہے۔ اکثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ بغیر مزاح کے طنز گالی بن جاتی ہے۔ اس طرح طنز کے بارے میں میرا خیال ہے کہ بغیر طنز کے مزاح "خالی" بن جاتا ہے۔ وہ مزاح جو خالی ہے ظاہر ہے کہ کھوکھلا ہے، بے اثر ہے بے کار ہے۔ اس لیے اس مزاح کو مزاح نہیں صرف مسخرگی کہنا زیادہ بہتر ہے۔

اس کے برخلاف پروفیسر احتشام حسین طنز کے لیے مزاح کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن مزاح کے لیے ان کے نزدیک طنز ضروری نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

طنز میں ناگواری کی جو کیفیت ملتی ہے شاید اسی وجہ سے بہت سے لوگ اسے مزاح سے الگ کر کے دیکھتے ہیں چنانچہ تھیکرے اور میریڈتھ دونوں نے مزاح کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ طنز کا وجود مزاح کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ہاں مزاح سے طنز بالکل پاک بھی ہو سکتا ہے۔"

(ماہنامہ آج کل سید احتشام حسین اگسٹ ۴۵ء ص ۱۲)

پروفیسر آل احمد سرور بھی اعلیٰ طنز کے لیے مزاح کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں،

"اعلیٰ طنز میں ظرافت اور ادبی حسن دونوں ضروری ہیں خالص

ظرافت، نشیب و فراز کا احساس دلا کر ایک مسرت یا انبساط پیدا کرتی ہے۔ طنز میں مسرت اور خوشی ملی جلی ہوتی ہے۔"

(تنقید کیا ہے از پروفیسر آلِ احمد سرور ص ۵۴)

حقیقت یہ ہے کہ طنز کے لیے ظرافت اور ظرافت کے لیے طنز ضروری ہے۔ اعلیٰ درجہ کا طنز بغیر مزاح کے اعلیٰ مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس طرح سے اعلیٰ درجہ کی ظرافت کے لیے طنز لازمی اور ناگزیر ہے۔ اس سلسلہ میں برگساں کا خیال سب سے زیادہ متوازن معلوم ہوتا ہے۔ وہ طنز کے لیے ظرافت اور ظرافت کے لیے طنز کو ضروری سمجھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"ظرافت، ہجو کی فریق ہے۔ دونوں طنز کے اسلوب ہیں، لیکن ہجو فطری طور پر فصاحت اور بلاغت کی حامل ہوتی ہے جبکہ ظرافت سائنٹیفک ہوتی ہے۔ ہم کسی اچھے خیال کی مدد سے جس قدر بلند مقام پر ہوتے ہیں، ہجو ہمیں اور بلند مقام ہونے پر زور دیتی ہے۔ ہجو اتنی شدت سے آگے بڑھتی ہے کہ وہ اعلیٰ خوش بیانی کی قسم بن جاتی ہے۔ برخلاف اس کے ظرافت میں ردعمل اس کے مخالف ہوتا ہے۔"

(رشید احمد صدیقی فن اور شخصیت از ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ص ۱۱۸)

برگساں کی ہجو کے بارے میں جو خیال پیش کیا گیا ہے وہ مغربی زبانوں کی ہجو نگاری کے بارے میں بالکل صحیح ہے۔ لیکن اردو فارسی میں ہجو کے سلسلہ میں عمومی طور پر یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ وہ اپنی شبیہہ صورت میں اعلیٰ خوش بیانی کی ایک

قسم بن جاتی ہے کیونکہ اُردو اور فارسی میں ہجو کی روایت بعض وقت اعلیٰ خوش بیانی کے برخلاف پھکّڑ بازی ابتذال ہزل اور فحش گوئی تک پہنچی ہے ہے۔ البتہ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ہجو اور ظرافت ایک طرح سے لازم و ملزوم ہیں۔

۵۵

طنز و مزاح کا تاریخی پس منظر

انسانی فطرت میں طنز و مزاح شاید اس وقت سے شامل ہے جب کہ وہ دورِ وحشت میں تھا۔ اصل میں طنز و مزاح انسانی فطرت کے دو بنیادی جذبے ہیں جس طرح محبت اور نفرت ہر دور میں انسانی فطرت میں داخل رہے ہیں۔ اس طرح طنز و مزاح بھی انسانی فطرت کے لازمی اور ناگزیر جز رہے ہیں۔ مزاح کا تعلق یا مزاح کا اظہار انسان کے ایک اہم اور بنیادی جذبے خوشی ہی کے ایک اہم پہلو سے ہے اور اس طرح طنز بھی انسان کے ایک بنیادی جذبہ نفرت کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ اس لیے طنز و مزاح کی تاریخ اسی وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جب خود انسان کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ لیکن مزاح کے مقابلہ میں طنز کا آغاز ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں شروع ہوا ہوگا۔ کیونکہ مزاح کا اظہار انسان کسی بھی طرح سے کر سکتا ہے۔ اور ہنسنا ہنسانا انسانی زندگی کی ابتدا ہی سے ظاہر ہے۔ لیکن طنز کا اظہار ایک خاص قسم کے قابو کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ

طنز مزاح کے مقابلہ میں زیادہ پیچیدہ جذبہ ہے۔ اس لیے طنز میں نفرت، غصّہ جھنجھلاہٹ، سب وشتم سب ہی شامل ہوتے ہیں۔ لیکن جب تک ان کو قابو میں رکھ کر ایک خاص رنگ نہیں دیا جاتا۔ اس وقت تک طنز یا طنزیات کا ظہور نہیں ہوتا۔ طنز شائستگی اور تہذیب کا متقاضی ہوتا ہے۔ نفرت، غصّہ، جھنجھلاہٹ جیسے راست جذبات کے اظہار سے طنز نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ ان کو ایک شائستہ اور مہذب شکل دینے سے طنز وقوع پذیر ہوتا ہے۔

انسانی زندگی کے ہر علم اور ہر فن کی تاریخ کا آغاز یونان اور روم سے شروع ہوتا ہے۔ یونان اور روم علوم کے سرچشمے رہے ہیں۔ آج سائنس اور اس کی شاخیں خواہ وہ طب ہو یا طبیعات، نباتیات، فلکیات ہو یا نجوم، جوہر کا علم ہو یا کوئی اور علم ان سب کا آغاز یا ان کے بارے میں ابتدائی تصورات سب کے سب یونان سے یا پھر روم سے تعلق رکھتے ہیں۔

سائنسی علوم کی طرح عمرانی علوم کے آغاز کا تعلق بھی یونان ہی کی سرزمین سے رہا ہے۔ خواہ وہ سیاسیات ہو یا سماجیات، معاشیات ہو یا نفسیات، فلسفہ ہو یا تاریخ، ان سب کی ابتداء کا سہرا یونان ہی کے سر رہا ہے۔ فنونِ لطیفہ کی تاریخ کا آغاز بھی یونان ہی کے سر رہا ہے۔ یونان سے پہلے شاعری کا وجود تو ثابت ہوتا ہے لیکن شاعری کو علم وفن کا درجہ یونانیوں نے ہی دیا۔ اس طرح مصوری ہو یا بت تراشی، موسیقی ہو یا رقص مجسمہ سازی ہو یا تعمیر ان تمام علوم میں یونان کی حیثیت معلمِ اول کی رہی ہے۔

ادبیات میں بھی یونانی نظریوں اور یونانی فکر نے اہم ترین اور اولین

کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اس لیے طنز و مزاح کی تاریخ سے بھی جب بحث ہوتی ہے تو لازمی طور پر یونان اور روم سے رجوع ہونا پڑتا ہے۔ یہ بات متنازعہ فیہ ہے کہ طنز و مزاح کا آغاز یونان سے ہوا یا روم سے یونان سے روم متاثر ہوا یا روم سے یونان، بہرحال یونان اور روم اور علوم و فنون کی طرح طنز و مزاح میں بھی سب سے مقدم حیثیت رکھتے ہیں۔

یونان میں طنز و مزاح کا آغاز وہاں کے مذہبی رسوم کی تکمیل کے سلسلہ میں ہوتا ہے۔ یونان کے دو مقدس دیوتا تھے۔ ایک دیوتا زراعت "غلے" کا سمجھا جاتا تھا۔ جسے "الہۃ الفلاحت" کا نام دیا گیا تھا۔ دوسرا دیوتا شراب اور عیش و نشاط کا سمجھا جاتا تھا۔ جسے "الہۃ الخمر" کہا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ دیوتاؤں کی پرستش ان کو خوش کرنے کے لیے کی جاتی تھی اور ان دیوتاؤں کی نذر عام طور پر مختلف قسم کے اناج اور شراب ہوا کرتی تھی۔ جب پرستش کے مراسم ختم ہو ہوتے تو جشن منایا جاتا تھا۔ چونکہ دیوتا زراعت اور شراب کے تھے اس لحاظ سے اس جشن کے موقع پر کھانا پینا لازمی طور پر ہوتا تھا۔ گویا رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں۔ عیش و نشاط کے دور میں سب ہی شریک ہوا کرتے، عورت، مرد، بچے بوڑھے، جوان چونکہ شراب نوشی بھی کثرت سے ہوا کرتی تھی۔ اس لیے اس عیش و مسرت کے جشن میں ہنسی دل لگی، مذاق، تمسخر پھکڑ بازی و طنز، سب و شتم برہنگی، بے راہ روی سب کچھ ہی ہوتا۔ طنز و مزاح کا آغاز یونان میں انہی حالات میں ہوا تھا۔ جیسا کہ اس سے پہلے یہ کہا جا چکا ہے کہ یہ بات متنازعہ فیہ ہے کہ طنز و مزاح کے سلسلے میں تقدم یونان کو حاصل ہے یا روم کو۔ جولیس اسکلیگر اور ہنس آس کا خیال ہے کہ طنز

ومزاح کی روایت اور اس کے مختلف نظریات روم نے یونان سے اخذ کیے ہیں اور جولیس اسکیلگر اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں خود لفظ سٹائر کو پیش کرتا ہے اس کا کہنا ہے کہ یہ لفظ "سطیرس" سے ماخوذ ہے سطیرس ایک مختلف الاعضا جانور ہے جو بکرے اور آدمی کی شکل سے مرکب ہے اور اس کی ہیئت چونکہ الھۃ الفلاحت جیسی ہے اور الھٰۃ الفلاحت یونان کا دیوتا ہے اس لیے طنز یا سٹائر یونان سے روم منتقل ہوا۔ اس کے برخلاف قونطلین اور ہورئیں کا دعویٰ یہ ہے کہ طنزیات کی ابتدا اور نشو ونما خود روم میں ہوئی ہے اور وہاں سے یونان منتقل ہوئی ہے۔ بہرحال طنز کی ابتدا روم میں ہوئی ہو یا یونان میں یورپ میں طنز کا آغاز یونانی اور لاطینی زبانوں کے علم ہی کی وجہ سے ہوا۔

مغربی ادب میں طنز و مزاح کی بڑی طویل تاریخ ہے اور مختلف عرب ممالک میں اونچے درجہ کے اور بڑے طنز نگار گذرے ہیں۔ اردو میں طنز و مزاح کی روایت خاص طور پر انگریزی طنز و مزاح سے متاثر رہی ہے اس وجہ سے یہاں صرف انگریزی کے یا مغربی طنز و مزاح نگاروں کا سرسری ذکر کیا جاتا ہے۔ انگریزی تاریخ میں طنز نگاری میں جیوفری چاسر (سنہ ۱۳۴۰ء تا ۱۴۰۰ء) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جیوفری چاسر کا طنز بہت ہی نرم تھا۔ اس کے پاس طنز کی تیزی اور تندی نہیں ملتی۔ اس کے طنز کا نشانہ عام طور پر صرف اخلاقی کمزوری ہوا کرتی ہے۔ لیکن وہ ملٹن کی طرح تیز دار اور تند انداز میں طنز کرتا ہے نہ اس کی طرح مضحکہ اڑاتا ہے جیوفری چاسر کے پاس نفرت کا اظہار نہیں ملتا بلکہ وہ صرف کمزوریوں پر

ہنستا ہے۔ ایسے ہلکے پھلکے اور لطیف طنز کے تعلق سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ ایسا طنز بہ نسبت تلخ و تند اور تیز طنز کے جو جوناتھن سویفٹ، (۱۶۶۷ تا ۱۷۴۵ء) کے پاس ملتا ہے اس سے زیادہ پراثر ہوتا ہے۔

ولیم سیکسپیر کا نام عام طور پر طنز کے سلسلہ میں نہیں لیا جاتا۔ لیکن آر۔ جے۔ ریس کے کہنے کے مطابق۔

"اس کے بعض ڈرامے بالکلیہ طنزیہ ہیں جیسے "لیفس لیبرس لاسٹ" میں مرد اور عورت کی برتری کے تعلق سے طنز ملتا ہے اس طرح "ایس یو لائک اٹ" میں اس زمانے کے بعض حالات کا طنز ملتا ہے۔"

"انگلش لٹریچر از آر۔ جے۔ ریس طبع لندن صفحہ ۱۵۱"

ولیم سیکسپیر کا طنز بھی جیوفری چاسر کے مانند دل چسپ اور خوش دلی پر مبنی ہوتا ہے۔ چارلس ڈکنس (۱۸۱۲ تا ۱۸۷۰ء) کا بھی عام طور پر طنز نگاری کے سلسلے میں ذکر نہیں کیا جاتا۔ لیکن اس کے بارے میں آر۔ جے۔ ریس کا کہنا ہے کہ اس نے اپنے زمانے کی سماجی ناانصافیوں پر تنقید کی ہے۔ اور طنز کیا ہے۔" ایسے طنز نگار مصنفین جو عام طور پر طنز نگار مصنفین جو عام طور پر طنز نگار نہیں سمجھے جاتے لیکن جن کے پاس طنزیہ انداز ملتا ہے ان کی فہرست بے حد طویل ہو سکتی ہے۔ ان طنز نگاروں میں جس میں آسٹن (۱۷۷۵ء تا ۱۸۱۷ء) جارج ایلیٹ ایچ۔ جی ویلس اور ولیم ہولڈنگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جان ڈرائڈن (۱۶۳۱ تا ۱۷۰۰ء) سے لے کر جارج برنارڈ شاہ (۱۸۵۶ء تا ۱۹۵۰ء) آر۔ جے۔ ریس کے کہنے کے مطابق۔

"ہر ایک قابل ذکر اور اہم ڈرامہ نگار کے پاس طنز و مزاح کا انداز ملتا ہے۔"

(انگلش لٹریچر از آر۔ جے ریس۔ طبع لندن ص ۱۵۲)

انگریزی ادب میں طنز نگاری کی وجہ سے جو ادیب خاص طور پر نمایاں ہیں اور جو اپنی طنز نگاری کی وجہ سے ایک ممتاز مقام کے مالک ہیں ان میں جوناتھن سویفٹ ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ سویفٹ نے اپنی مشہور تصنیف "گلیورس ٹراولس" میں یورپ اور انگلستان کے سماجی اصلاحات پر انتہائی گہرا طنز کیا ہے۔ یورپ اور انگلستان میں اخلاقی اور سماجی حالات جو انتہا درجہ تک پست ہو گئے تھے تب سویفٹ نے اپنی قیامت خیز تجویز "اے ماڈسٹ پروپوزل" پیش کی تھی۔ سویفٹ نے جس زمانے میں یہ تجویز وہاں کے ملکیوں کے لیے پیش کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قحط اور افلاس کا دور دورہ تھا۔ قحط اس قدر شدید تھا کہ لوگ فاقوں سے مر رہے تھے۔ حکومت بے بس تھی اور کوئی صورت کارگر ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ ان حالات میں اس نے اپنی تجویز پیش کی تھی کہ "غریب والدین کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ہلاک کر دیا جائے اس کی رائے تھی کہ معصوم بچوں کے رانوں کا کباب عمدہ ہوتا ہے اور سینہ کا گوشت اور قورمہ کے لیے بے حد موزوں ہو سکتا ہے۔" اس نے اپنی اس تجویز کا یہ فائدہ ثابت کیا تھا کہ ان بچوں کو ذبح کرنے سے ان کے والدین کو ایک بڑی مصیبت اور فکر سے نجات مل جائے گی۔ دوسری طرف ان لڑکوں پر جو خرچ آتا ہے اور جو غذا صرف ہوتی ہے وہ الگ بچ جائے گی اور تیسرے خود ان کا گوشت غذا کے کام آئے گا۔ یوں قحط و افلاس کی شدت سے نجات حاصل

کی جا سکتی ہے ۔" اس طرح سویفٹ کے پاس انتہائی شدید بلکہ وحشیانہ طنز ملتا ہے۔ سویفٹ کے بعد منفی قسم کی خیالی دنیا پیش کر کے طنز کرنے میں سویفٹ کے انداز کا طنز جن انگریزی طنز نگاروں کے پاس ملتا ہے ان میں ایڈیسن ولیم میکریس تھاکرے (۱۸۱۱ تا ۱۸۶۳ء) اور ٹینیسن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جس طرح نثر نگاری میں سویفٹ ایک امتیازی اور نمایاں مقام کا مالک ہے۔ اس طرح طنزیہ شاعری میں جان ڈرائڈن بے حد ممتاز ہے۔ ڈرائڈن کا اہم طنزیہ کارنامہ "ایبسلم اینڈ اکیبٹوفل" ڈرائڈن نے اپنے اس طنزیہ کارناموں کے ذریعہ اس زمانے کے سیاسی حالات کو موضوع بنایا ہے۔ ڈرائڈن کی یہ نظم اپنی زوردار طنز نگاری کی وجہ سے آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ ڈرائڈن کے کم عمر معاصرین میں الگزنڈر پوپ سنہ (۱۶۸۸ تا ۱۷۴۴ء) کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ پوپ ڈرائڈن کا مقلد اور اس کا پرستار رہا ہے ۔ پوپ کا طنز آر۔ جے۔ ریس کے کہنے کے مطابق اپنے اخلاقی مقاصد کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی فنی چابک دستی پر منحصر ہے۔ پوپ نے اپنی نظموں میں اپنے زمانے کی مختلف شخصیتوں کو ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ پوپ کی ایک مشہور نظم "دی ریپ آف دی لاک" اپنے لطیف طنز کے اعتبار سے شاہکار کا درجہ رکھتی ہے ۔ اس نظم میں پوپ نے اپنے زمانے کے متمول فیشن زدہ سوسائٹی پر بھرپور طنز کیا ہے۔ مثال کے طور پر اس نے قصے کی ہیروئن کو ایک سنگھار میز کے قریب آرائش حسن و جمال میں مصروف بتایا ہے۔ ہیروئن اپنے آرائش حسن کے لیے گھنٹوں صرف کرتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک جنگ جو یا جاں باز سپاہی میدان کارزار جانے

سے پہلے اپنے آپ کو تیار کرتا ہے ۔ پوپ نے اس زمانے کی اونچی سوسائٹی میں جو اخلاقی اقدار کا فقدان ہوگیا تھا ان پر بھی اپنے طنزیات کے تیر برسائے ہیں ۔ اصل میں پوپ اور سویفٹ ایک ہی مکتبہ خیال کے رکن ہیں سویفٹ اور پوپ کے ہمعصروں میں جانسن، رابرٹ براؤن (۱۸۱۲ء تا ۱۸۸۹ء) اور آلیور گولڈ اسمتھ (۱۷۳۰ تا ۱۷۷۴ء) وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان تمام مصنفین کے پاس کہیں کہیں طنزیہ انداز ملتا ہے ۔ پوپ سویفٹ یا ڈرائیڈن کی طرح ان کے پاس بھرپور طنز نہیں ملتا۔

OO

شخصیت

فکر تونسوی کے ہم عصر طنز نگار جناب کنہیا لال کپور نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "فکر تونسوی نے اردو ادب میں ایک لفظ تونسہ کا اضافہ کیا ہے" (اندر جیت لال نے مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۷۵ء دہلی میں راقم کو یہ بات بتائی) فکر تونسوی کے طنزیات و فکریات پر کچھ لکھنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ فکر کے وطن مالوف تونسہ کے بارے میں بنیادی معلومات اور اس کا تاریخی و جغرافیائی پس منظر بھی ہمارے سامنے ہو تاکہ ان کے وطن مالوف یا مقام پیدائش کے بارے میں کوئی تونس باقی نہ رہ جائے۔

تونسہ ضلع ڈیرہ غازی خاں پنجاب (پاکستان) کا آخری قصبہ ہے جو کوہ سلیمان کے دامن میں واقع ہے۔ ہندوپاکستان کی تقسیم سے پہلے تونسہ کا اگر ہم تصور کریں تو تونسہ پر ہندوستان کی عمل آوری ختم ہو جاتی تھی۔ تونسہ سرحد سے بالکل قریب کا علاقہ ہے۔ یہاں تمندار کی حکومت تھی۔ تونسہ کے اطراف میں

چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی تھیں۔ تونسہ سے تین چار میل دور آزاد قبائل کی آبادیاں شروع ہوتی تھیں۔ یہ قبائل وراثتاً محنتی اور جفاکش واقع ہوئے تھے۔ یہ قصبہ چونکہ کسی قدر بلندی پر واقع ہوا ہے اس لیے یہاں کی زمین پتھریلی واقع ہوی ہے۔ لیکن یہ عجیب و غریب حقیقت ہے کہ زمین پتھریلی ہونے کے باوجود زرخیز بھی ہے۔ کوہ سلیمان کے درّے سے ایک پہاڑی نالہ سنگھڑ نامی نکلتا تھا۔ جو تونسہ کو سیراب بھی کرتا اور کبھی کبھی اجاڑ بھی دیتا۔ تونسہ کے باشندے سادہ لوح، جفاکش اور قانع تھے۔ تونسہ ہندو اور مسلمان دونوں کا ملا جلا مسکن تھا۔ اسلامی فلسفۂ حیات اور ہند و طرز فکر دونوں کا غیر محسوس قسم کا امتزاج یہاں کے باشندوں کو متاثر کرتا تھا۔ دونوں فلسفوں کی صحت مند اخلاقی اور سماجی قدریں بود و باش اور مشترکہ رہن سہن تہذیبی سرگرمیوں میں جاری و ساری تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں فرقے آپس میں شیر و شکر کی طرح اپنی زندگی گزارتے تھے۔ بقول فکر تونسوی "مذہبی منافرت جو سنٹرل انڈیا میں زہر ملا رہی تھی اس سے وہاں کے باشندے نہ صرف ناآشنا تھے بلکہ پاک تھے"۔ (خط بنام راقم از فکر تونسوی)

تونسہ جو کوہ سلیمان کے دامن میں واقع ہے۔ یہاں ایک مشہور و مقبول خدا رسیدہ صوفی منش حضرت خواجہ شاہ سلیمان کا روضۂ مبارک ہے۔ آپ کا تعلق سلسلۂ خواجگان میں پینتیسویں نمبر پر آتا ہے۔ سلسلۂ خواجگان کے تین اور بزرگ ہستیاں جو آپ کے بعد گذری ہیں جن میں حضرت خواجہ مخدوم اللہ بخش تونسوی اور حضرت خواجہ حافظ محمد موسی تونسوی اور خواجہ محمد حامد تونسوی کے مزارات بھی یہیں واقع ہیں۔ حضرت خواجہ سید سلیمان تونسوی

کی شخصیت سارے تونسہ میں عزت و افتخار کا باعث تھی، آپ کے درس و مواعظ میں جہاں مسلمان جوق در جوق آتے وہیں ہندو حضرات بھی بصد احترام موجود رہتے۔ آپ قومی یک جہتی کے زبردست علمبردار واقع ہوئے تھے۔

تونسہ کے اِردگرد کے پچاس پچاس میل دور علاقوں سے بھی ہزاروں زائرین و معتقدین بلالحاظ مذہب و ملت شریک ہوتے۔ کوہ سلیمان کے آزاد قبائلی علاقے سے بھی ہزاروں بلوچی شریک عرس ہوتے۔ یہ بلوچی زائرین حضرت خواجہ سید سلیمان تونسوی کی مزار پر بھیڑ بکریاں دنبے اور بھیڑیں اور پھر اپنی حیثیت کے موافق نقدی نذر کرتے۔ حضرت ممدوح کی تعلیمات اور اندازِ فکر کا سارے تونسہ پر اثر تھا فکر تونسوی کے بیان کے مطابق جب منقسم ہند و پاک کا المناک حادثہ وقوع پذیر ہوا اور جس کے نتیجہ میں سارے ہندوستان میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی تھی۔ لیکن تونسہ کی سرزمین ایسی تھی جہاں کسی ہندو یا مسلمان کا ایک قطرۂ خوں بھی نہیں بہا۔ حضرت کے گدّی نشینوں نے جن کو قومی یک جہتی کی تعلیم دی گئی تھی۔ اپنی خانقاہوں میں سارے تونسہ کے ہندو حضرات کو پناہ دی۔ یہ ہندو حضرات جتنے دن خانقاہوں میں مقیم رہے ان کے لیے تین وقت کے کھانے اور چائے کا مفت انتظام کیا گیا تھا۔ گدی نشینوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ انھیں اپنی حفاظت میں لے کر دستوں کی شکل میں یہ ہندو حضرات جہاں جہاں جانا چاہتے تھے وہاں وہاں ان کی منزلوں تک بہ حفاظت تمام پہنچایا۔

ان مذکورہ بالا تمام واقعات سے تونسہ میں جو ہندو مسلم یگانگت تھی اس پر روشنی پڑتی ہے اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب

جس مضبوطی سے وہاں قدم جمائے ہوئے تھی وہ بھی نمایاں ہوتی ہے فکر تونسوی کے اندازِ فکر اور ان کی وسیع المشربی اور روشن خیالی کو سمجھنے کے لیے اس پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اس وجہ سے یہاں مختصراً اس کو پیش کیا گیا ہے۔

سلسلۂ نسب :-

من موہت رائے
(فکر تونسوی کے دادا)

دھن پت رائے (فکر تونسوی کے والد) — بھوجت رائے (فکر تونسوی کے چچا)

نانک چند (فکر کے بڑے بھائی) — دیوی دیال (فکر کے منجھلے بھائی) — اسم نامعلوم (فکر کی بہن) — رام نارائن (فکر تونسوی)

فکر تونسوی کے پاس جو خاندانی ریکارڈ ہے وہ صرف دو پشت تک ہی کا محفوظ ہے۔ فکر کو چونکہ اس بات کا علم نہیں تھا کہ مستقبل میں ان پر تحقیقی کام ہوگا اور وہ مستقبل کے نامور اور ممتاز طنز نگار ہوں گے۔ فکر لاابالی شخصیت کے مالک ہیں اس کی وجہ سے ان کے پاس اپنے خاندان کے بارے میں کوئی باقاعدہ اور شجرہ کی صورت میں کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اپنے خاندان کے متعلق جو معلومات ان کے پاس محفوظ ہیں وہ ان کے والد اور والدہ کی بتائی ہوئی معلومات ہیں۔ فکر کے کہنے کے مطابق ان کا سلسلۂ نسب راجپوتوں سے ملتا ہے۔ وہ ہندوستان میں اپنی بہادری اور شجاعت کی ایک لمبی داستان رکھتے ہیں۔ ان کی وفاداری، جفاکشی، و دلیرانہ واقعات سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ فکر کے دادا من موہت رائے کے دو لڑکے تھے، دھن پت رائے اور بھوجت رائے۔ دھن پت رائے کے گھر تین لڑکے اور

ایک لڑکی پیدا ہوی۔ نانک چند دھن پت رائے کے بڑے لڑکے تھے۔ دیوی دیال، منجھلے اور لڑکی کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ چوتھے لڑکے رام نارائن (فکر تونسوی) راجپوتوں کے جس قبیلے سے فکر اور ان کے آبا و اجداد کا تعلق ہے وہ بہادری شجاعت اور زیورِ علم سے آراستہ تھے۔ فکر ذات کے بھاٹیہ ہیں اور مذہبی اعتبار سے ہندو ہیں۔

فکر کے دادا من موہت رائے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا شمار گاؤں کے شرفا میں ہوتا تھا۔ تونسہ میں ان کی بہت عزت کی جاتی تھی، زمین داری بھی کرتے تھے اور تجارت بھی دیانت داری کے اصولوں پر تجارت اور زندگی کے سارے کاروبار انجام دیتے تھے۔

تونسہ میں جب کبھی پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے تو تونسہ کے سب ہی لوگ من موہت رائے کو ثالث بناتے اور ان کا فیصلہ آخری اور قطعی تصور کیا جاتا۔ من موہت رائے نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ کسی مکتب یا کسی پاٹھ شالہ کے فارغ التحصیل نہیں تھے۔ قبائلی زبان اردو اور فارسی میں ملکہ رکھتے تھے جس کو انھوں نے گھر پر ہی حاصل کی تھی۔ انھیں طبابت سے خاص دل چسپی تھی۔ کوئی ستر سال کی عمر میں موہت رائے کا انتقال ہوا۔ جیساکہ اوپر تذکرہ کیا گیا ہے کہ من موہت رائے کے دو لڑکے تھے۔ دھن پت رائے اور بھوپت رائے۔ دھن پت رائے نے بھی کسی اسکول یا مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوی۔ جب ہوش سنبھالا تو اپنے والد کے ساتھ ان کی تجارت اور زمین داری میں ہاتھ بٹانے لگے، چونکہ من موہت رائے انتہائی دیانت دار واقع ہوئے تھے۔ دھن پت

رائے کو بھی زراعت میں زمینداری اور تجارت کے علاوہ دیانت داری بھی ملی
تونسہ میں ان کی بھی ویسی ہی عزت کی جاتی تھی جیسی کہ ان کے والد کی عزت
کی جاتی تھی۔ دھن پت رائے نے ابتدا میں کوہ سلیمان کے اندر جو قبائلی
آباد تھے وہاں ایک چھوٹی سی دوکان کھول لی اور تجارت کو فروغ دینا شروع
شروع کیا۔ قبائلی ان کے ساتھ مکمل تعاون کرتے تھے۔ کئی بلوچی سرداران
کے گھر آتے اور مختلف امور میں ان سے مشورہ طلب کرتے تھے۔ والد سے
علمِ طب سیکھا تھا۔ تونسہ میں اس علم کے باعث انہیں اور بھی عزت ملی۔
وہ غریبوں کا مفت علاج کرتے تھے۔ طبابت کو دھن پت رائے نے پیشہ
کے طور پہ بھی استعمال کیا۔ تجارت اور طبابت کے پیشوں سے قبل وہ ایک
جاگیر دار چودھری نارائن سنگھ کے پاس میر منشی کے فرائض انجام دے چکے
تھے۔ چودھری نارائن سنگھ جاگیر دار کی ایمان داری اور دیانت داری کی وجہ
سے بڑی عزت کرتا تھا۔ دھن پت رائے جب اپنے کاروبار سے فارغ
ہوتے تو ان کی مصروفیت مطالعہ ہوی۔ انہیں کتابیں پڑھنے کا بہت شوق
تھا۔ خصوصاً مذہبی اور تاریخی کتب ان کے مطالعہ میں ہمیشہ رہتیں۔ تاریخ
اور مذہبی قصایص سناتے تھے۔ وہ طبعاً ملنسار اور مخلص واقع ہوئے تھے۔
گاؤں والوں کی جو پنچ ہوتی وہ اس میں احترام سے بلائے جاتے، کسی بھی الجھے
ہوئے مسئلہ کا تصفیہ انہیں سے کروایا جاتا اور ان کے فیصلہ کو سب ہی
قبول کرتے۔ جفاکش اور سخت محنت کے عادی تھے۔ ان کی دلیری کے
قصے بھی مشہور ہیں۔ دھن پت رائے نے پینسٹھ سال کی عمر پائی۔ من موہت
رائے کے دوسرے بیٹے بھوجت رائے نے بھی اپنی زندگی کا آغاز زمینداری

اور تجارت ہی سے کیا تھا۔ زمین داری اور تجارت سے پیسہ بھی خوب کمایا انھیں بھی اپنے بھائی کی طرح کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ تونسہ میں ان کی بھی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ شکار کا شوق بھی بچپن ہی سے تھا۔ ان کی طبیعت میں بھی ملنساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کے مکان بھی تونسہ کے اکثر قبائلی آجایا کرتے تھے۔ ان کا انتقال دھن پت رائے کے انتقال سے پہلے ہوا۔ ان کے دو بیٹے ہیں جو آج بھی فکر کے پاس آتے رہتے ہیں۔

دھن پت رائے کے بڑے لڑکے نانک چند کو ابتدا ہی سے تعلیم سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے اپنے والد کے برخلاف تجارت، طبابت یا زمین داری نہیں کی بلکہ گاؤں ہی کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور تونسہ ہی کے ایک اسکول پر صدر مدرسی کے فرائض انجام دیئے۔ نانک چند کا شمار گاؤں کے چند پڑھے لکھے لوگوں میں ہوتا تھا۔ والد کی طرح یہ بھی نیک نفس ملنسار طبیعت کے مالک تھے۔ تونسہ کے پڑھے لکھے لوگ اکثر گھر پر موجود رہتے اور مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ انہیں ادبی ذوق اپنے والد سے ملا تھا۔ تونسہ میں پہلی بار نانک چند ہی نے روزنامہ اخبار منگوانا شروع کیا۔ اخبار کے علاوہ ادبی، مذہبی اور ثقافتی رسائل بھی نانک چند منگواتے۔ رسائل اور اخبارات پڑھنے کے لیے مختلف مدرسوں کے طلباء اور نوجوان ان کے گھر آیا کرتے تھے۔ ان کا گھر لائبریری یا کتب خانے سے کم نہیں تھا۔ قبائلی زبانوں کے علاوہ اردو اور انگریزی میں خاص اہلیت رکھتے تھے۔

دھن پت رائے کے منجھلے لڑکے دیوی دیال تھے۔ فکر کے الفاظ میں قصبہ میں عاشق مشہور تھے۔ وہ اپنے والد کے تدبّر، جانفشانی یا محنت کسی سے

بھی متاثر نہیں ہوتے تھے۔ ویسے طبعاً ذہین ضرور تھے لیکن خاندانی رسومات ومعاملات سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ حسن پرست تھے جدھر جی چاہا نکل گئے۔ کئی کئی دن گھر سے غائب بھی رہتے تھے۔ دیوی دیال نے خاندانی روایات کو صرف برقرار ہی نہیں رکھا بلکہ اہل خاندان سے بغاوت بھی کردی تھی نفرت کا اظہار کیا تھا۔ بغاوت کے نتیجہ میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ گھر سے غائب ہو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ فکر کے کہنے کے مطابق تقسیم ہند کے وقت نہ جانے کہاں غائب ہو گئے اور آج تک ان کا اتا پتہ نہیں ہے۔ دیوی دیال حسن پرستی کے ساتھ بعض دوسری عادات میں بھی مبتلا ہو گئے تھے۔ افیون کثرت سے کھاتے تھے۔ کسی بھی معاملہ میں انہیں کامیابی نہیں ہوی۔ چونکہ ماحول سازگار نہیں تھا اس لیے آپ کی عادتیں اور بگڑتی گئیں۔ کسی کی پند ونصائح کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ باغیانہ ذہن نے گھر سے راہ فرار اختیار کرنے کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ فکر اپنے منجھلے بھائی کی شخصیت کے بعض پہلوؤں سے بے حد متاثر رہے ہیں اور ان باتوں کو انھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنا لیا ہے۔ خاص طور پر حسن پرستی اور بغاوت کا جذبہ ان کی شخصیت میں نمایاں طور پر ملتا ہے اور یہہ دونوں پہلو نہ صرف ان کی شخصیت بلکہ ان کے فن کو بھی متاثر کرتے رہے ہیں۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

دھن پت رائے کو دو لڑکوں کے بعد ایک لڑکی ہوی ان کو بھی ادبی ذوق ورثہ میں ملا ہے۔ گھر گرہستی اور امور خانہ داری میں بڑی ذمہ داری کے ساتھ انجام دے رہی ہیں۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور رکھتی

ہیں۔ ان کے بھی دو لڑکے ہیں فکر جی جان سے اپنی بہن اور ان کے لڑکوں کو چاہتے ہیں۔ فکر کی بہن اپنے لڑکوں کے ساتھ پنجاب میں رہتی ہیں فکر کے بہنوئی پنجاب میں زراعت کرتے ہیں اور خوش حال زندگی گذار رہے ہیں۔

دھن پت رائے کے آخری لڑکے رام نارائن (فکر تونسوی)، ۷ر اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ۲ بجے صبح شجاع آباد ضلع ملتان میں پیدا ہوئے۔

شجاع آباد ضلع ملتان (حال پاکستان) سے ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے جہاں فکر کے والد ایک زمین دار کے ہاں ہیڈ منشی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور شجاع آباد ہی میں ایک عرصہ تک قیام کیا مگر زمین دار و جاگیردار چودھری نارائن سنگھ کی بے ایمانیوں سے تنگ آکر شجاع آباد چھوڑ دیا اور پھر اپنے وطن واپس آگئے۔

یہاں یہ بات دل چسپ ہے کہ پیدائش کے لحاظ سے فکر شجاع آبادی یا ملتانی کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن وہ ہر لحاظ سے تونسوی ہیں، اس لیے کہ جب ان کی عمر دو یا تین ماہ تھی ان کے والد ملتان سے تونسہ آگئے تھے اور تونسہ ہی میں فکر کی پوری شخصیت کی تعمیر ہوئی۔

ابتدائی تعلیم:

دھن پت رائے خود فارسی اردو اور قبائلی زبانوں پر اچھا عبور رکھتے تھے۔ رام نارائن (فکر تونسوی) چونکہ اپنے والد کے سب سے چھوٹے لڑکے تھے اس لیے باپ کے بے حد چہیتے بھی تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم خود ان کے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ اور یوں چوتھی یا پانچویں تک گھر پر ہی تیاری ہوئی۔ وہ تمام کتابیں جو مدرسہ میں پڑھائی جاتی تھیں وہ سب کی سب گھر پر ہی پڑھا دی

گیئں۔ فکر کو پانچویں جماعت سے ہی مدرسہ میں شریک کرا دیا گیا۔ ان کا پہلا مدرسہ "مڈل اسکول مگروٹھہ تحصیل تونسہ" ہے۔ یہاں انھوں نے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ فکر کی ذہانت اور طباعی ابتدائی جماعتوں ہی سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی برتری کا سکہ سارے ہم جماعتوں پر بٹھا دیا۔ امتحان ہوا تو فکر نے درجہ اول میں کامیابی حاصل کی۔ اور اپنا ایک پوزیشن بنا لیا۔ مڈل اسکول مگروٹھہ تحصیل تونسہ سے آٹھویں جماعت پاس کر لینے کے بعد "میٹرک اسکول تونسہ" میں داخلہ لے لیا اور وہیں سے میٹرک کیا۔ اردو زبان سے انھیں شروع ہی سے دلچسپی تھی اس لیے اردو زبان میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے اور سب سے کم نمبر ریاضی میں۔ میٹرک اسکول تونسہ سے میٹرک کامیاب کر لینے کے بعد "ایمرسن کالج" "ملتان" (حال پاکستان) میں ایف اے میں داخلہ لے لیا۔ ان ہی دنوں دھن پت رائے کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے فکر اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ انھوں نے کالج سے ایف۔ اے کا پہلا سال تکمیل کیا اور ایف۔ اے کے دوسرے سال میں بھی آ گئے۔ لیکن ایف۔ اے تکمیل کر نہیں پائے۔

دھن پت رائے کے انتقال کے بعد خاندان میں اور کوئی ایسا بزرگ یا عزیز نہ تھا جو ان کو اور ان کے برادران کو سہارا دیتا۔ بڑے بھائی جو کماتے وہ سب کے لیے کافی نہ تھا۔ منجھلے بھائی تو آوارہ منش تھے۔ خاندان کو ان سے کسی بھی قسم کی کوئی توقع نہیں تھی۔ اب لے دے کے فکر رہ گئے تھے۔ فکر اگرچہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی

حساس طبیعت نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ وہ اپنے خاندان کی مالی الجھنوں کو سلجھانے میں کچھ مدد نہ کریں طبیعت کی اس افتاد نے انھیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنے بڑے بھائی کے دوش بدوش خاندان کی ذمہ داریوں کو اُٹھانے کے لیے فکرِ معاش میں نکل پڑے۔

اسکول کی سرگرمیاں:

مڈل اسکول سیگروٹھ تحصیل تونسہ میں واقع تھا۔ آبادی کم تھی۔ آبادی ہونے کے باعث طلبار بھی بہت کم آتے تھے۔ مڈل اسکول میں طلبار کی جملہ تعداد ڈیڑھ سو تھی، ان میں بہت کم طلبا ایسے تھے جن کو ادب سے خصوصی دل چسپی تھی۔ سرگرمیاں محدود تھیں۔ فکر مطالعہ اور محنت میں وقت گذارتے تھے۔ اسکول میں گیمس کھلائے جاتے تھے۔ لیکن انھوں نے کسی بھی کھیل میں حصہ لینے سے توبہ کر لی تھی کھیل سے تھوڑی سی دل چسپی بھی انہیں راس نہ آئی۔ گیمس اور اسپورٹس کے علاوہ اسکول میں ہفتہ واری، ماہوار علمی ادبی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ ان محفلوں میں بحث و تقریر کے لیے کوئی ایک موضوع دے دیا جاتا تھا۔ فکر ان ادبی محفلوں میں دل و جان سے شریک ہوتے۔ نہ صرف شریک ہوتے بلکہ جس عنوان پر تقریر کرنی ہوتی پہلے اپنا نام لکھواتے اور بحث و مباحثہ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔

ان بحث و مباحث اور تقریری مقابلوں کے علاوہ تحریری مقابلے بھی مڈل اسکول اور ہائی اسکول میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ فکر ان تحریری مقابلوں میں بھی سب سے بازی لے جاتے۔ فکر جتنے دن ہائی اسکول میں رہے

گیئیں۔ فکر کو پانچویں جماعت سے ہی مدرسہ میں شریک کروا دیا گیا۔ ان کا پہلا مدرسہ "مڈل اسکول مگروٹھ تحصیل تونسہ" ہے۔ یہاں انھوں نے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ فکر کی ذہانت اور طباعی ابتدائی جماعتوں ہی سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی برتری کا سکہ سارے ہم جماعتوں پر بٹھا دیا۔ امتحان ہوا تو فکر نے درجہ اول میں کامیابی حاصل کی۔ اور اپنا ایک پوزیشن بنا لیا۔ مڈل اسکول مگروٹھ تحصیل تونسہ سے آٹھویں جماعت پاس کر لینے کے بعد "میٹرک اسکول تونسہ" میں داخلہ لے لیا اور وہیں سے میٹرک کیا۔ اردو زبان سے انھیں شروع ہی سے دلچسپی تھی اس لیے اردو زبان میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے اور سب سے کم نمبر ریاضی میں۔ میٹرک اسکول تونسہ سے میٹرک کامیاب کر لینے کے بعد "ایمرسن کالج ملتان" (حال پاکستان) میں ایف اے میں داخلہ لے لیا۔ ان ہی دنوں دھن پت رائے کا انتقال ہو گیا۔ جس کی وجہ سے فکر اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ انھوں نے کالج سے ایف۔ اے کا پہلا سال تکمیل کیا اور ایف۔ اے کے دوسرے سال میں بھی آ گئے۔ لیکن ایف۔ اے تکمیل کو نہیں پائے۔

دھن پت رائے کے انتقال کے بعد خاندان میں اور کوئی ایسا بزرگ یا عزیز نہ تھا جو ان کو اور ان کے برادران کو سہارا دیتا۔ بڑے بھائی جو کماتے وہ سب کے لیے کافی نہ تھا۔ منجھلے بھائی تو آوارہ منش تھے۔ خاندان کو ان سے کسی بھی قسم کی کوئی توقع نہیں تھی۔ اب لے دے کے فکر رہ گئے تھے۔ فکر اگر چہ کہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی

حساس طبیعت نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ وہ اپنے خاندان کی مالی الجھنوں کو سلجھانے میں کچھ مدد نہ کریں طبیعت کی اس افتاد نے انھیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنے بڑے بھائی کے دوش بدوش خاندان کی ذمہ داریوں کو اُٹھانے کے لیے فکرِ معاش میں نکل پڑے۔

اسکول کی سرگرمیاں:

مڈل اسکول میگروٹھ تحصیل تونسہ میں واقع تھا۔ آبادی کم تھی۔ آبادی ہونے کے باعث طلبار بھی بہت کم آتے تھے۔ مڈل اسکول میں طلبار کی جملہ تعداد ڈیڑھ سو تھی، ان میں بہت کم طلبار ایسے تھے جن کو ادب سے خصوصی دل چسپی تھی۔ سرگرمیاں محدود تھیں۔ فکر مطالعہ اور محنت میں وقت گذارتے تھے۔ اسکول میں گیمس کھلائے جاتے تھے۔ لیکن انھوں نے کسی بھی کھیل میں حصہ لینے سے توبہ کرلی تھی کھیل سے تھوڑی سی دل چسپی بھی انہیں راس نہ آئی۔ گیمس اور اسپورٹس کے علاوہ اسکول میں ہفتہ واری، ماہوار علمی ادبی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ ان محفلوں میں بحث وتقریر کے لیے کوئی ایک موضوع دے دیا جاتا تھا۔ فکر ان ادبی محفلوں میں دل وجان سے شریک ہوتے۔ نہ صرف شریک ہوتے بلکہ جس عنوان پر تقریر کرنی ہوتی پہلے اپنا نام لکھواتے اور بحث ومباحثہ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔

ان بحث ومباحث اور تقریری مقابلوں کے علاوہ تحریری مقابلے بھی مڈل اسکول اور ہائی اسکول میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ فکر ان تحریری مقابلوں میں بھی سب سے بازی لے جاتے۔ فکر جتنے دن ہائی اسکول میں رہے

اور ان کے دوران تعلیم جتنے تحریری مقابلے ہوئے انھوں نے انعام اول جیتا، فکر کی تقریری و تقریری صلاحیتوں کو دیکھ کر ہائی اسکول کے صدر مدرس اور دوسرے اساتذہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ ہائی اسکول ہی کے زمانے سے فکر کی ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو ادب سے دل چسپی تقریری اور تحریری مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینا خود اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ جس زبان کے ممتاز و مقبول مصنف و طنز نگار بننے والے تھے اس کے جراثیم ان میں داخل ہو گئے تھے۔

فکر کی اعلیٰ صلاحیتوں کو دیکھ کر ان کے بعض اساتذہ اکثر یہ کہا کرتے، "رام نارائن تم ہم سے بھی آگے بڑھ رہے ہو۔ تمہاری علمی و ادبی سطح ہم سے اونچی ہوتی جا رہی ہے۔ فکر اپنے استادوں سے یہ بات سنتے ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر بکھر جاتی اور پھر وہ کوئی کتاب سینے سے لگائے کسی خاموش گوشے میں چلے جاتے۔

فکر کے اساتذہ :

مڈل اسکول میگر وٹھ تحصیل تونسہ کے صدر مدرس صالح محمد صاحب تھے۔ مڈل اسکول کے زمانے میں پہلی شخصیت جس نے فکر کو متاثر کیا وہ صالح محمد تھے۔ جو ایک اچھے ادیب اور مضمون نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ موصوف کسی بھی خالی گھنٹہ یا فرصت کے اوقات میں فکر کو بلوا لیتے اور اپنی تخلیقات سنانے کے بعد فکر سے تبصرہ یا اظہار رائے کی خواہش کرتے، فکر ان کی تخلیقات میں جو خوبیاں محسوس کرتے یا انھیں جو باتیں پسند نہ ہوتیں اس کا

برملا تذکرہ کر دیا کرتے۔ فکر کی صاف گوئی اور تنقیدی صلاحیت سے صالح محمدؔ بہت خوش ہوتے اور ان کو گلے سے لپٹا لیتے اور دعا دیتے کہ رام نارائن تمھارا مستقبل درخشاں ہو اور میں تم سے بڑی امیدیں وابستہ رکھتا ہوں۔

ٹڈل اسکول کے ایک اور مدرس جنھوں نے فکر کو متاثر کیا ہے وہ قاضی علی محمد صاحب تھے یہ فکر کے بڑے بھائی کے قریبی دوست بھی تھے اور اکثر گھر آیا کرتے تھے۔ موصوف شعر و ادب کا نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ فکر کی ادبی صلاحیتوں کو دیکھ کر قاضی علی محمد صاحب نہ صرف ان کا حوصلہ بڑھاتے بلکہ ہر ممکن طریقے سے ان کو جلا دینے کی کوشش کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ اس زمانے سے فکر کے مطالعہ میں اس وقت کے موقر رسائل و کتب رہتے۔ قاضی علی محمدؔ ادبی دنیا (لاہور) "شاہکار" (لاہور) بطور خاص فکر کو پڑھنے کے لیے دیا کرتے تھے۔ اس طرح اچھی اور معیاری و ادبی کتابیں وہ فکر کو تحفتاً دیا کرتے تھے۔ جب فکر ان کتب کو پڑھ چکتے تو وہ فکر سے ان کتب میں پیش کیے گئے ادب کے بارے میں سوالات کرتے، ادبی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈلواتے، کتابوں اور مضامین کی قدر و قیمت پر تبصرہ بھی کرتے۔ قاضی صاحب کے دل نشین اور موثر انداز تفہیم کا اثر آج بھی فکر محسوس کرتے ہیں۔ فکر کا بیان ہے کہ قاضی صاحب کے الفاظ اور گفتگو کا دل نشین انداز آج بھی ان کے کانوں میں گونجتا رہتا ہے۔

یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ فکر نے "ایمرسن کالج میں داخلہ لیا تھا۔ ایف۔ اے کا پہلا سال مکمل کیا تھا اور آخری سال مکمل نہ کر سکے تھے۔ فکر کی کالج کی زندگی بڑی مختصر رہی۔ سب سے پہلے زیادہ قابل افسوس بات

تو یہ ہے کہ وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے ۔ انھیں تعلیم کو مجبوراً ترک کر دینا پڑا تھا۔ ایمرسن کالج کی زندگی بہ مشکل آٹھ نو ماہ کی رہی ۔ جس طرح مڈل اور ہائی اسکول ..... میں فکر کو مضمون نویسی اور تقریری مقابلوں میں شرکت کا شوق تھا۔ کالج میں آنے کے بعد ان کے اس جنون میں اور اضافہ ہونا چاہیئے تھا۔ ان کے اندر جو جوہر چھپے ہوئے تھے انھیں آشکار ہوتا تھا، مڈل اسکول سے کالج آنے تک ذہنی سطح یقیناً اونچی ہو گئی تھی۔ بیشتر کتب کا مطالعہ ان کی ادبی صلاحیتوں میں اضافہ کا باعث ہو چکا تھا۔ معیاری اور غیر معیاری ادب میں فرق کرنے کی تمیز بھی آ چکی تھی، لیکن کالج میں ہم فکر کو دیکھتے ہیں تو وہ بجھے بجھے سے تفکرات کا احساس لیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ فکر کو اب اپنی ذمہ داریوں کا احساس شدت سے ہونے لگا تھا، وہ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد اپنی تعلیم کو پائے تکمیل تک پہنچائیں تاکہ خاندان کے مالی مسائل کو حل کرنے میں اپنا حصہ ادا کریں۔ اب فکر کو اس بات کی فکر لاحق ہو گئی تھی کہ ان کے والد ضعیف ہو چکے ہیں اور بہ حیثیت اولاد کے انھیں حقیقی معنوں میں ماں باپ کے لیے بڑھاپے کا سہارا بننا چاہیے، چونکہ دھن پت رائے کے مسائل محدود سے محدود تر ہوتے جا رہے تھے۔ آمدنی کا واحد ذریعہ اب صرف دوکان داری تھی۔ اور اس ذریعہ کو بھی کام میں لانا ان کے والد کے لیے ناممکن بنتا جا رہا تھا۔ دوکان داری برقرار رکھنا ان کے والد کے لیے بے حد مشکل مسئلہ ہو گیا تھا۔ اور ادھر فکر تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھتے ہوئے دوکان کے کاروبار چلانے سے قاصر تھے۔ جمع پونجی جلتی بھی تھی وہ بھی آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی تھی ۔ ان تمام اسباب کے پیش نظر فکر کے سامنے ایک ہی راستہ تھا وہ یہ کہ وہ اپنی تعلیم ترک کر کے

تجارت کے کاروبار سنبھال لیں۔ تعلیم کو ترک کرنا اور کاروبار میں حصہ لینا بھی وہ کشمکش تھی۔ ذمہ داری کا بھی احساس تھا جو فکر کی کالج کی زندگی میں پورے طور پر نمایاں ہونے لگا تھا۔ ان تمام حالات نے فکر کی باغ و بہار شخصیت کو قبل از وقت خزاں گزیدہ بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس زمانے میں، عین شباب کے زمانے میں لاپرواہ اور بے پرواہ، زندگی کی سرگرمیوں میں پوری طرح حصہ لینے کے بجائے اپنے ہی مسائل کو حل کرنے میں غلطاں و پیچاں نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو ان کے مسائل کی گتھیاں تھیں جن کو سلجھانے میں فکر اتنے محو ہو گئے کہ وہ تعلیمی سرگرمیوں میں بھی پورے انہماک سے حصہ نہ لے سکے۔ دوسری طرف ان کے اساتذہ سے بھی ان کا ربط ضبط اسی وجہ سے بڑھ نہ سکا۔ اور خاندان کے افراد میں بھی کوئی ایسا نہ تھا جو ان کی صلاحیتوں سے باخبر ہو سکا۔ اور ان کے تفکرات یا مسائل کے حل کرنے میں ان کی کوئی مدد کر سکا۔ اس کا ایک بڑا سبب خود فکر کی غیور طبیعت تھی کیونکہ ان کی خودی اور خودداری نے اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ وہ اپنے مسائل دوسروں کے سامنے، حد یہ کہ اپنے اساتذہ کے سامنے پیش کریں اور دست سوال کسی کے آگے دراز کریں۔ فکر آج بھی خوئے سوال کو حد درجہ بُرا سمجھتے ہیں۔ ان تمام حالات نے فکر کو کالج کی زندگی میں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اور وہ اسکول کی زندگی کی طرح سب پر چھائے ہوئے نظر نہیں آتے۔ اپنی زندگی کے اس دور کے بارے میں فکر نے راقم الحروف کو بتایا کہ :

"خاندان کے مالی کراسیس سے پریشانی کے باعث نہ کالج کی ادبی نہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتا۔ لیڈر بننے سے

ہمیشہ گھبراتا رہا۔ لیڈر کے آزمود ہتھیار استعمال کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہا بلکہ ان سے نفرت رہی"۔

اَدبی زندگی کا آغاز

فکر کی ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی سے ہوا۔ جب وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے اس زمانے سے ہی شعر موزوں کرنا شروع کر دیا تھا۔ فکر کی شاعری غزل گوئی سے شروع ہوتی ہے۔ ابتدا ہی سے فکر کی یہ کوشش رہی کہ جو بات بھی کہی جائے یا تو نئی ہو یا کم از کم نیا پن رکھتی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں ایک آٹھویں جماعت کے طالب علم سے اس بات کی توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ اساتذہ کے سارے دوادین پڑھ ڈالے اور اساتذہ نے جن موضوعات کو جس انداز سے برتا ہے اس سے بچ کر یا ان کو نئے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اس کے لیے بھی سخت ترین مشق اور مزاولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ضروری ہے کہ نئی بات کہنے کے لیے مطالعہ بہت وسیع ہو۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس عمر میں بھی فکر نے میرؔ، غالبؔ، داغؔ، ذوقؔ، مومنؔ، اقبالؔ، اور ٹیگور جیسے عظیم شاعروں کا مطالعہ کر لیا تھا۔ اسکول ہی کے زمانے میں ان کے استاد قاضی محمد علی صاحب جو نہایت صاف ستھرا ادبی و شعری ذوق رکھتے تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ فکر کو اپنی نظمیں اور غزلیں سنایا کرتے تھے اور فکر سے خواہش کرتے کہ وہ بھی کچھ سنائیں۔ فکر اپنے استاد کی نگارشات سن تو لیتے لیکن اپنی کوئی غزل یا نظم استاد کو سنانے سے گریز کرتے۔ ویسے فکر کے پاس چند غزلیں اور نظمیں

ہوگئی تھیں۔

فکر کی پہلی غزل کا پہلا شعر ملاحظہ فرمائیے:

وہی تو غضب سے جیتا وہی میں غضب سے ہارا
ابھی تو نے روک رکھا ہے کہیں کوئی اک اشارا

فکر نے کسی استاد سے اپنی شاعری پر اصلاح نہیں لی۔ ان کے کہنے کے مطابق "میرا واحد استاد میرا شعور اور اعتماد نفس تھا"۔ فکر کی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ضرور ہوتا ہے لیکن انھیں ادبی ماحول میسر نہ آنے کے باعث ان کی غزل گوئی پروان نہ چڑھ سکی۔ فکر اپنے شاعری کے بارے میں راقم الحروف کو بتایا کہ "اقتصادی جدوجہد کے دوران نظم گوئی کی طرف رجحان مبذول ہوگیا"۔

فکرِ معاش

"جب ہمارے گھرانے پر شدید اقتصادی کراسس آیا تو میں روٹی روزی کے خانگی میدان میں لیکا و تنہا کو دپڑا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی طویل جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ ماں باپ کی موجودگی کے باوجود اپنے آپ کو بے سہارا یتیم سمجھ کر کچھ کر دکھانے کے جذبے نے مجھ سے ہر کام کروایا مگر ماتھے پر بل نہ آیا"۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ ایمرسن کالج سے فکر بی۔اے مکمل نہ کر سکے۔ مکمل نہ کرنے کی بہت سی وجوہات تھیں، ایک ایک تو یہ کہ ان کے والد کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ صحت کی خرابی کے باعث فکر کے والد نے دوکان داری چھوڑ دی تھی۔ دوکان داری کے بند ہو جانے سے روزانہ جو آمدنی ہوتی تھی وہ مسدود ہوگئی تھی۔ دوران تجارت

دھن پت رائے نے کچھ پس انداز ضرور کیا تھا یہ پس انداز کی ہوئی رقم ہزاروں اور لاکھوں میں نہیں تھی جسے وہ بیٹھ کر پانچ دس سال آرام سے کھا سکتے کوئی جائیداد خرید سکتے یا کسی اور تجارت میں اشتراک کرتے جو کچھ بھی انھوں نے جمع کیا تھا وہ صرف چند ماہ کا سرمایہ تھا جب یہ پونجی ختم ہوگئی تو خاندان کے ہر فرد نے اپنے تیں یہ فیصلہ کیا کہ اب اسے روٹی روزی کے لیے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنا ہے۔

نانک چند نے اپنے باپ کی ہی زندگی میں ایک اسکول میں ملازمت شروع کر دی تھی۔ قلیل آمدنی تھی پھر ان کی اپنی ذمہ داریاں تھیں یعنی گھر بیوی بچے وغیرہ، ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اپنی ذاتی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالتے ہوئے والدین اور گھر کے دوسرے افراد کی بھی کفالت کر سکیں۔ گو دھن پت رائے کی زمین بھی تھی۔ لیکن ان کے کسی بھی لڑکے کو زراعت اور کھیتی باڑی سے دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی اس پیشہ کا انہیں کوئی تجربہ تھا اس وجہ سے ان میں سے کسی نے بھی اس طرف توجہ نہ کی۔

فکر کے منجھلے بھائی جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ بے حد لاابالی اور بے انتہا غیر ذمہ دار قسم کے آدمی تھے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے ماں باپ کی الجھنوں کو سلجھاتے وہ ان میں اضافہ ہی کرتے رہتے تھے۔ یہ ماں باپ کا خیال تو کیا کرتے خود ماں باپ کو ان کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ غرض کہ ان سے کسی قسم کی کوئی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

دھن پت رائے کے چہیتے اور لاڈلے لڑکے رام نارائن (فکر تونسوی) کی غیور طبیعت نے یہ برداشت نہیں کیا کہ ان کا باپ ضعیف و مجبور

ہو کر گھر پر پڑا رہے اور یہ باپ کی پونجی کو آزادانہ خرچ کرواتے رہیں۔ ان کے سامنے بڑے بھائی کا رویہ تھا۔ چھوٹے بھائی کی آوارہ گردی تھی اور سب سے بڑھ کر باپ کی گرتی ہوئی صحت اور ضعیفی ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے فکر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا نہیں چاہتے تھے۔ ابھی فکر کی عمر اٹھارہ برس کی تھی کہ انھوں نے تعلیم کو خیرباد کر دیا اور ۱۹۳۶ء سے روٹی روزی کے جنگی میدان میں یکا و تنہا کود پڑے اور اس طرح ان کی معاشی جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے۔ فکر معاش کے سلسلہ میں فکر نے حقیقی معنوں میں طرح طرح کے پاپڑ بیلے ہیں جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

فکر کا مزاج چونکہ لڑکپن سے "ادیبانہ" تھا اس لیے انھوں نے اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی زمین میں ہل جوتنے سے انکار کر دیا۔ حساب میں شروع ہی سے کمزور تھے۔ شاید اسی لیے باپ کی چھوڑی ہوئی دوکانداری کو ہاتھ نہیں لگایا توقع تھی کہ اگر باپ کی دوکان کی گدّی سنبھال لیتے تو قصبہ کے سارے لوگ جوان کے باپ سے معاملت کرتے تھے ان کے ساتھ بھی تعاون کرتے لیکن وہ ہل گدّی اور گھر کے آرام دہ گدّے چھوڑ کر دو خالی ہاتھ لیے روزگار کی تلاش میں نکل کھڑے ہو گئے۔

فکر کی پہلی ملازمت کا آغاز خوش نویسی کے فن سے ہوتا ہے۔ ایک مقامی خوش نویس کے پاس انھوں نے چند ہی دنوں میں اس فن پر عبور حاصل کر لیا وہ زیادہ دن تک اس فن کے جنجال میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ کام چلاؤ حد تک خوش نویسی سیکھ لی تھی۔ خوش نویسی سیکھنے کے بعد ڈسٹرکٹ بورڈ شیخوپورہ کے ہفتہ وار اخبار "کسان" میں بحیثیت خوشنویس

کام کرتے تھے۔ یہ سلسلہ روزگار ایک سال تک چلتا رہا جس سے انہیں ماہانہ پانچ روپیہ مل جایا کرتے تھے۔ ایک سال تک اخبار کسان میں کام کرنے کے بعد یہ نوکری چھوڑ دی۔ کسی اخبار کے دفتر میں زائد اجرت پر بحیثیت خوش نویس کام نہیں کیا بلکہ ایک رنگریز جیمنی داس کے ہاں ملازم ہو گئے۔ یہاں ان کو پگڑیاں اور دوپٹے رنگنا اور چھپائی کا کام کرنا پڑا۔ چھ ماہ تک رنگریز کے پاس ملازمت کی۔ وہ شب و روز کام کرتے۔ لیکن جیمنی داس انھیں معاوضہ بہت کم دیتا تھا یعنی روزانہ صرف دو آنے چھ ماہ بعد فکر نے یہ رنگین نوکری بھی چھوڑ دی۔ برو کے قلم سے خوش نویسی سیکھی تھی۔ نوکِ قلم کے ہر زاویئے سے واقف ہو گئے تھے۔

رنگ، ریزہ کی نوکری سے رنگ ملانے اور رنگ بنانے سے تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ اب فکر ایک پینٹر کی حیثیت سے ہاتھ میں برش سنبھالے بغل میں رنگوں کا خریطہ لیے دیواروں پر مختلف فرموں اور کمپنیوں کے اشتہارات کوئی چار ماہ تک لکھتے رہے۔ چار ماہ تک یہ مشغلہ رہا اس سے پیسے بھی کمائے گر، معاوضہ چونکہ کم ملتا تھا اس لیے اس نوشتۂ دیوار والی پینٹنگ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

ایک مقامی آریہ پرائمری اسکول جو عام پورہ ضلع ڈیرہ غازی میں واقع تھا۔ مدرس کے لیے درخواست دی جو فوراً منظور کر لی گئی۔ آریہ پرائمری اسکول پرائیوٹ تھا۔ پرائیوٹ اسکول کا انتظامیہ ہمیشہ یہی کوشش کرتا ہے کہ اسکول کے نتائج دوسرے مدارس سے اچھے نکلیں۔ اس لیے نہ صرف طلباء کا زیادہ وقت لیا جاتا ہے بلکہ اسکول کے اساتذہ سے

بھی سخت کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ فکر نے بہ حیثیت مدرس اس مدرسہ میں اپنی بہتر صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ان کا انداز افہام و تفہیم بڑا متاثر کن ہوتا۔ اس سے پہلے یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ فکر لا ابالی طبیعت کے مالک ہیں فکر نے ابتدائی چند ماہ پابندی کے ساتھ اسکول جاتے رہے اور درس و تدریس میں اپنا وقت صرف کرتے رہے لیکن انہیں یہ احساس ہر وقت ستایا کرتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمائیں اور اپنے ماں باپ کے قدموں میں ڈال دیں۔ فکر نے ابتداء میں جو پابندی دکھائی وہ زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکی۔ ایک ہی سال کے اندر اندر قبل اس کے کہ پرائیوٹ اسکول کا انتظامیہ انہیں نوٹس دیتا وہ خود دامن جھٹک کر الگ ہو گئے۔

پرائیوٹ اسکول میں کام کرتے ہوئے ایک خوش بودار تیل بنانے والی کمپنی "تیل چنبیلی اسپشل" جس کا مالک دھومی تھا اس سے ایک ایجنسی کے متعلق بات کر لی۔ ایجنسی مل جانے کے بعد فکر سارے قصبے میں گھوم گھوم کر خوش بودار تیل کی شیشیاں، بوتلیں فروخت کیا کرتے۔ کام اچھا تھا۔ لیکن محنت طلب زیادہ ایک ہی دوکان کے چار چار چکر لگانے پڑتے، دوستوں نے انھیں فریب دیا اور وہ مروت میں مار کھا گئے۔ جس توقع سے ایجنسی لی تھی اس سے کچھ ایسا فائدہ نہیں ہوا بلکہ الٹا نقصان ہی ہونے لگا۔ ایجنسی واپس کر دی گئی اور یہ تیل اسپیشل چنبیلی کا کاروبار بھی بند ہو گیا۔

فکر کے اندر کا آدمی ان سے یہ سب نہیں کروانا چاہتا تھا۔ ان میں جو

لکھنے لکھانے کی خداداد صلاحیت تھی وہ کچھ اور کام لینا چاہتی تھی۔ چنانچہ مزاج لڑکپن سے ادیبانہ تھا وہ ادب کی خدمت کے لیے ہی سرگرداں تھے۔

ضلع ڈیرہ غازی خاں (حال پاکستان) میں ایک مردِ مجاہد کی طرح کوئی سمین ساڑھے تین سال تک فکرِ معاش میں جد و جہد کرتے رہے۔ غمِ روزگار نے انھیں خوب ستایا لیکن وہ غمِ روزگار سے عاجز نہیں آئے۔ ان کی رگوں میں راجپوتوں کا خون ہے عزائم، ہمتوں اور حوصلوں سے راجپوتوں کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ فکر نے اپنی حیات کے لیے اور اپنے ماں باپ کی کسی مالی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہر وہ محنت طلب کام کیا جو ان کے خاندان میں کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ چنانچہ فکر بہتر فکرِ معاش کے لیے ڈیرہ غازی خاں کے ڈیرہ سے باہر لاہور کا رخ کیا یہاں انھوں نے ایک کتب خانہ میں کتابوں کے پیاکٹ بنانے کا کام کیا۔ اس کتب خانہ میں کام کرنے سے فکر کو بہت سی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ جو کتابیں انھیں پڑھنے کو ملیں وہ سیاسی، ادبی، سماجی، تاریخی، مذہبی اور فلمی، غرض کہ ہر قسم کی کتابیں ان میں شامل تھیں جس کتب خانہ میں فکر پیاکٹ بنانے پر مامور تھے۔

راقم الحروف کو فکر نے اپنی ایک اور ملازمت کے بارے میں بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ واقف کروایا کہ ان سے کتب خانہ میں چپراسی کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ سارے کتب خانے کی جھاڑو لگائی جاتی تھی۔ انہیں کے کہنے کے مطابق یہ فرائض بھی فکر نے خوش اسلوبی سے انجام دیے لیکن ماتھے پہ شکن نہ آئی۔

اس طرح زندگی فکر سے "بڑی بے ادبی" کے ساتھ پیش آتی رہی

لیکن فکر زندگی کو بھی ادب سکھانا چاہتے تھے اور خود بھی ادیب بننا چاہتے تھے اور اس ہی جذبہ کی بدولت انھوں نے شیخوپورہ سے ایک نیم ادبی اور نیم فلمی نکلنے والے ہفتہ وار کی ادارت قبول کرلی اور یوں ان کے "من کی موج" پوری ہوئی، یہ من کی موج ان ہی کی نہیں، اس رسالہ کی بھی تھی۔ یعنی اس رسالہ کا نام "من کی موج" تھا اور وہ آٹھ نو ماہ تک اس رسالہ سے وابستہ رہے۔ اس وقت فکر کی عمر بئیس ۲۲ بائیس ۲۲ سال کی تھی۔

اب فکر ذہن اور خیال کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے۔ جب فیض احمد فیض کے الفاظ میں اندھیرے کی مہر لگتی ہے تو دن میں ستارے اترنے لگتے ہیں اب فکر بھی جوان تھے اور فکر کی فکر بھی بلوغ حاصل کر چکی تھی۔ زندگی کی رعنائیاں اور زندگی کا حسن فکر کے احساس جمال کو حسن اور عشق کی وادیوں کی طرف کھینچ رہا تھا اور ایسے میں وہ جوانی کے خوش گوار حادثے جو حسن و عشق کی جنوں خیزیوں کا زینہ بنتے ہیں، فکر کو پیش آنے لگی تھیں۔ فکر نے طوفان خیز اور بلاخیز عشق تو نہیں کیا اور وہ کر بھی کیسے سکتے تھے جب کہ وہ فکر تھے "رام نارائن" ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ فکر بن چکے تھے اور یہ فکر کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا، گو جوانی کی راتیں اور امنگوں کے دن ان کے حصہ میں کم ہی آئے تھے۔ پھر بھی دل سنگ و خشت ہی تو نہیں ہوا کرتا۔ اس کو درد سے بھر آنا ضرور تھا اور فکر اپنی اس عشقیہ دردمندی کا ذکر اب بھی کرتے ہیں۔ معلوم نہیں "نوسارابان" کی لڑکی "بھاتو" نے ان کے فکر و خیال پر ڈاکہ ڈالا تھا یا پھر کوئی قبائلی بلوچی حسینہ تھی جس نے دل دینا چاہا تھا۔ بہرکیف ایسا ہی کوئی حسین واقعہ تھا جس نے رام نارائن کی رعنائی فکر کو مہمیز لگائی تھی۔ اب فکر فکرِ معاش کے ساتھ "فکرِ سخن" میں بھی مشغول ہوگئے

اور رام نارائن "فکر تونسوی" بن گئے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فکر کی شاعری اس زمانے میں شروع ہوئی تھی اور جیسے جیسے انہیں حالات میسر آنے لگے وہ شعر و ادب کی دنیا پر اپنی فکر انگیزیوں سے فکر و خیال کے پھول برساتے رہے۔

شاعری کے لیے فکر لطیف کی ضرورت ہوتی ہے اور جب فکر حالات کیف سے نکلے تو انھیں "ادب لطیف" میں (جو لاہور سے نکلا کرتا تھا) بحیثیت کلرک داخل ہوئے۔ اس لطیف ادبی ماحول میں فکر کی صلاحیتیں دو ایک سال میں اتنی نکھر آئیں کہ انھیں خود "ادب لطیف" کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ ادب لطیف کو جاری کیا تھا چودھری برکت علی نے اور اس کے سرپرست بھی اس زمانے میں چودھری برکت علی ہی تھے۔ ادارہ ادب لطیف سے وابستہ ہونے کے بعد فکر اور ادب لطیف دونوں ہی کو فائدہ پہنچا۔ ادب لطیف بغیر ادب لطیف بغیر نزاکتِ فکر کے اور احساس شعری ادب لطیف نہیں ہو سکتا ہے۔ اور فکر بغیر ادب لطیف کے شاعرانہ نزاکت خیال پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ فکر کو ایک مدت کے بعد وہ ماحول اور وہ فضاء حاصل ہوئی تھی جس کا گویا بچپن ہی سے وہ انتظار کر رہے تھے اس لیے فکر نے جی جان سے ادب لطیف کی خدمت میں اور اس کی ترقی و فروغ میں بہترین صلاحیتیں صرف کیں۔ ادب لطیف اس زمانے کا ایک باوقار اور بے حد معیاری رسالہ تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی ترقی اور فروغ میں فکر کی پرواز خیال کو کتنا دخل حاصل ہے لیکن اس زمانے کے سبھی لکھنے والے اس بات کو جانتے اور مانتے ہیں کہ فکر نے ہر ممکن طریقہ سے اس کے ادبی رنگ روپ نکھارنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔

فکر اگرچہ کہ سنہ ۱۹۴۲ء میں ادارۂ "ادب لطیف سے وابستہ ہوئے تھے۔

لیکن بحیثیت ایڈیٹر انھوں نے کوئی ڈیڑھ سال تک خدمت انجام دی۔ اس کے بعد وہ لاہور کے ممتاز ادیب و افسانہ نگار ممتاز مفتی کے اشتراک سے اپنا ایک علٰحدہ پرچہ "سویرا" نکالنے لگے۔ یہ رسالہ دوماہی تھا یہ "سویرا" اُردو کے ادبی رسالوں میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس رسالہ کی وجہ سے اُردو رسالوں کو ایک نیا وقار، نئی بلندی اور نیا معیار حاصل ہوا۔ سویرا نے ادبی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے سویرا اس وقت کے اُردو رسالوں کے لیے نصب العین کی حیثیت حاصل کر چکا تھا اور آج بھی اردو رسالوں کی تاریخ میں سویرا کو ایک اہم موڑ کی حیثیت حاصل ہے۔ سویرا کو ایسے اور اتنے اونچے درجہ کے اہل قلم کا تعاون حاصل رہا ہے۔ جس پر اُردو کا اعلیٰ سے اعلیٰ رسالہ بھی رشک کر سکتا ہے۔ اور بعد میں بھی شائد ایسے بہت کم رسالے ہوں گے جن کو ایسے اہلِ قلم یا ایسے درجہ کے لکھنے والوں کی نگارشات نصیب ہوتی ہوں۔ سویرا کے معاونین اردو شعروادب کے دو درخشاں ستارے ہیں جن کی روشنی سے آج بھی اُردو کے شعروادب کی دنیا میں سویرا نظر آتا ہے۔ ان لکھنے والوں میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت، چغتائی، احمد ندیم قاسمی، فراق گورکھپوری، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، اختر الایمان، قتیل شفائی، شفیق الرحمٰن، وامق جون پوری، یوسف ظفر اور ایسے ہی اُردو کے کتنے اہم اور قابلِ فخر ادیب شامل ہیں۔ سویرا میں فکر نے اپنی عظیم صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ فکر سویرا ممتاز مفتی کے حوالہ کر کے دوبارہ ادارۂ ادبِ لطیف سے وابستہ

ہو گئے بلکہ اس کی دوبارہ ادارت سنبھال لی۔

فکر کی شادی خانہ آبادی

فکر کی زندگی میں ۱۹۴۶ء تک کا زمانہ کئی حیثیتوں سے بڑا بارآور ثابت ہوا۔ اسی زمانہ میں فکر کی شاعرانہ صلاحیتیں منظرِ عام پر آئیں اور اسی زمانے میں انھیں اپنی پچھلی "بے ادب" زندگی سے چھٹکارا ملا۔ ایک طرح زندگی ان کے فکر و خیال کے مطابق ڈھل رہی تھی۔ ادبی زندگی سے جو انھیں شغف تھا، اسی زمانے میں وہ پورا ہو رہا تھا۔ ادبِ لطیف، سویرا اور دوسرے اداروں سے نکلنے والے رسائل کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ شعر و ادب کی دنیا میں ان کی شخصیت جانی پہچانی بن چکی تھی۔ فکر کو غمِ روزگار سے جب کچھ فرصت ملی تو غمِ جاناں کے جال میں پھنس گئے۔ یعنی ان کی شادی ان کی اپنی برادری میں "کیلاش کماری" سے ۱۹۴۴ء میں ہو گئی اور یوں فکر اب ایک طرح سے مطمئن زندگی گزارنے کے موقف میں آ گئے تھے۔ فکر کی رفیقۂ حیات گو معمولی پڑھی لکھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک لائق شریکِ حیات ہونے کا حق ادا کر رہی ہیں اور ازدواجی زندگی کے لحاظ سے فکر بھی کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔

فکر ۱۹۴۷ء اور لاہور

سنہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک فکر بڑی حد تک مطمئن زندگی گزار رہے ہیں اس زمانے میں ان کا قیام لاہور ہی میں تھا۔ لاہور میں فکر کا

یہ قیام کئی لحاظ سے ان کی زندگی کا خوش گوار حصہ رہا ہے۔ لاہور میں ان کے دوست احباب کافی تعداد میں تھے۔ ازدواجی زندگی کا سکون بھی انھیں میسر آگیا تھا۔ ادبی شہرت اور مقبولیت بھی ان کے قدم چومنے لگی تھی۔ پنجاب کی سرزمین کے پانچ دریا نہ صرف وہاں کی زمین کو سیراب کر رہے تھے بلکہ فکر کی تشنہ کام زندگی بڑی حد تک اسی سرزمین سے وابستہ ہو کر اپنی پیاس بجھا رہی تھی۔ پنجاب کے پانچ دریا، ستلج، چناب، جہلم، راوی اور بیاس، یہ دریائیں جس طرح سے پنجاب کی سرزمین کو سرسبز و شاداب کر کے اسے زندگی سے معنون کر رہی تھیں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے سہیل عظیم آبادی لکھتے ہیں۔

"ان پانچ دریاؤں کا دیس پنجاب اور پنجاب کے یہ پانچ دریا جن میں پگھلی ہوئی چاندی جیسا سفید اور چمکیلا پانی اور جس کا ایک ایک قطرہ آب حیات تھا اور جن کے بہاؤ میں زندگی کا نغمہ اور جن کے دھاروں سے سیراب ہو کر پنجاب کی زمین سونا اگلتی تھی جس کے کنارے لمبے چوڑے اور مضبوط سادہ لوح کسان اپنے کھیتوں میں ہل جوتتے ہیرا اور ماہیا گاتے تھے، جہاں کی ساری فضاء الہڑ اور شوخ دوشیزاؤں کے گیتوں اور معصوم قہقہوں سے معمور رہتی تھی جہاں خوش حالی اور مسرت کا راج تھا۔ جہاں کے رہنے والوں کی زندگی اور زندہ دلی دوسروں کے لیے رشک کا

باعث تھی۔"

("چھٹا دریا" از فکر تونسوی۔ مقدمہ از سہیل عظیم آبادی)

پانچ دریاؤں سے سیراب ہونے والا یہ صوبہ اپنی بڑی قدیم ادبی اور تہذیبی روایت رکھتا ہے، پنجاب ہندو مسلم تہذیب کے امتزاج کا وہ مقام ہے جہاں سے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا دریا بھی بہتا تھا، پنجاب میں ہندو سکھ اور مسلمان شیر و شکر ہو کر رہتے تھے۔ مرزا صاحبان کا لافانی عشق اس سرزمین کی حسین و دل کش روایات کا ایک زرین باب رہا ہے۔ وارث شاہ کے نغموں نے اس سرزمین میں ایسی شاعرانہ گھن گرج پیدا کی تھی جو ہندوستان کے کونے کونے میں سنائی دیتی تھی۔ اقبال جیسے مفکر اور شاعر حسن نے ساری انسانیت کو خودی اور خودداری کا پیغام دیا تھا۔ اسی سرزمین سے اٹھا تھا۔ انسانیت کے احترام کا یہ پیمبر شاعر اپنے پنجابی ہونے پر فخر کرتا تھا۔ گرونانک یا مذہبی پیشوا جس نے محبت انسانیت اور بھائی چارگی کو اپنے دین و مذہب کی اساس بنائی تھی وہ بھی اس سرزمین سے وابستہ رہا ہے۔ اس طرح سے پنجاب کے یہ پانچ دریا صرف یہاں کی سرزمین ہی کو سیراب نہیں کرتے بلکہ ان دریاؤں کی نغمہ ریزی بھی انسانیت کے لیے فردوس گوش ہوا کرتی تھی۔ لیکن ان دریاؤں سے علحدہ ایک چھٹا دریا بھی تھا جو نہ جانے کہاں سے اور کدھر سے یکا یک ابل پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس بھیانک دریا میں صرف پنجاب ہی کو نہیں بلکہ سارے ہندوستان کو زیر آب کر دیا۔ اور اس چھٹے دریا کے نیچے ہندوستان کی ساری تہذیب ساری عظمت اہنسا اور بھائی چارگی کی عظیم روایات، انسانیت اور

احترام آدمیت کے سارے اصول، تمام اخلاقی قدریں، دوستیاں، محبتیں، اخلاقی اصول مذہب، مسجد کی اذانیں، مندر کے ناقوس، گردواروں کے شاندار کلس، بہرکیف دین و مذہب، اخلاق و انسانیت کے سارے اصول، تمام آئین، خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے، اس طوفان خیز نجس اور غلیظ دریا میں ساری انسانیت تنکے کی طرح بہی جارہی تھی اور انسان اس دریا میں انسانیت کی زندگی اور تہذیب کی بقا کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے انسانیت کو بچاؤ۔ لیکن اس طوفان کی ہولناک گرج میں ان کی آواز، صدا بصحرا ہو رہی تھی۔ کوئی کسی کی سن سکتا تھا نہ کوئی انسان دوسرے کی مدد کر سکتا تھا، اس ہولناک اور خوف ناک دریا میں بے شمار انسان، انسانیت کی [illegible] باندھے ہوئے تھے۔ ان بے شمار انسانوں میں فکر بھی شامل تھے جو اپنی ہی نہیں بلکہ انسانیت کی فکر کر رہے تھے، انسانیت سوزی کا یہ چھوٹا دریا فکر کی زندگی اور ان کے فکر و خیال کو ایک نیا موڑ دیتا ہے۔ اب فکر وہ فکر نہیں جو فکر سخن میں مشغول رہتے تھے۔ اب انہیں انسانیت کی فکر تھی۔ تہذیب کی فکر تھی۔ اخلاقی قدروں کی فکر تھی۔ اعلیٰ انسانی آدرشوں کی فکر تھی۔ اس فکر نے فکر کو یقیناً فکر بنا دیا تھا۔

فکر کی زندگی میں ۱۹۴۷ء کے تقسیم ہند کا سانحہ بڑی اہمیت رکھتا ہے ۱۹۴۷ء میں فکر نے لاہور میں انسانیت سوزی کے ایسے ہولناک واقعات دیکھے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کے ذہن و خیال پر مرتسم ہو گئے۔ فکر نے لاہور میں ایسے بدبختانہ واقعات دیکھنے کے باوجود بڑی پامردی اور جرأت کے ساتھ ان حالات کو سہلا ہے، یہ پورا عرصہ جو لاہور کی تاریخ کا سیاہ ترین

باب تھا۔ فکر نے لاہور میں گذارے اور انھوں نے ان تمام حالات کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ اور بعد میں ان حالات کے خلاف اپنا سارا زور قلم صرف کیا۔ اور ان ہی حالات کی وہ سیاہی ہے جو آج تک بھی ان کے قلم سے روشنائی بن کر ٹپک رہی ہے۔ فکر نے جن حالات میں یہ دن گذارے ہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے سہیل عظیم آبادی لکھتے ہیں۔

جب لاہور میں آگ اور خون کا تماشا ہو رہا تھا اور تمام ہندو اور سکھ لاہور چھوڑ رہے تھے تو وہ لاہور میں رہا اپنے مسلمان دوستوں کے ساتھ اور ان کے گھروں میں اسے خود اپنے اوپر اور دوستوں پر بھروسہ تھا اور اس نے کبھی بے اطمینانی محسوس نہیں کی۔ شائد سارے لاہور میں وہ تنہا ہندو تھا جو ان ہنگامہ خیز دنوں میں شہر کے اندر اور مسلمانوں کے ساتھ شہر میں گھومتا رہا، ہوٹلوں میں چائے پیتا رہا۔"

"چھٹا دریا" از فکر تونسوی۔ مقدمہ از سہیل عظیم آبادی)

فکر لاہور میں بڑے کٹھن حالات میں گھرے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے سچے دوست اور بہی خواہ یعنی عارف عبد المتین یا قتیل شفائی اور ممتاز مفتی سایہ کی طرح فکر کے ساتھ رہے اور انہی کی دوستی اور محبت نے فکر کو انسان پر انسانیت پر بھروسہ کرنے اور یقین کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ فکر کے لیے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے" حالات کا تقاضہ تھا کہ فکر لاہور چھوڑ دیں لیکن فکر کی یہ خواہش تھی کہ وہ لاہور ہی میں رہیں۔ ایک طرف جان و مال کی سلامتی تھی تو دوسری طرف وضعداری

اور وفاداری کا تقاضہ تھا جہاں کے ہو وہیں کو ہو رہو، اس تذبذب اور کشمکش میں فکر نے اپنا فکری توازن برقرار رکھا، لیکن حالات ایسے تھے کہ پاکستان میں فکر کیلئے عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ فکر نے ان امور کے متعلق اپنی ڈائری "چھٹا دریا" میں لکھا ہے کہ

مجھے خود پاکستان کا شہری بننے پر مسرت ہے لیکن میری بات اور ہے اگر میری بجائے کوئی اور ہو اور اُسے قتل کی دھمکی دی جائے تو جان بچانے کی خواہش وفادارانہ شہریت کو کیونکر وہ برقرار رکھ سکے گی۔

(چھٹا دریا، از فکر تونسوی)

فکر مدت تک لاہور چھوڑنے اور نہ چھوڑنے کی اذیت میں گرفتار رہے۔ وہ اپنے احساس کو یوں اجاگر کرتے ہیں۔

میں پھر تذبذب میں گرفتار ہوں، لاہور کو چھوڑ دینے کی خواہش میری روح کے نہاں خانے سے جاتی ہی نہیں کتنا عذاب ہے یہ کتنی اذیت ہے یہ میں سوچتا ہوں کہ میری یہ ضد صالح ہے کہ میں لاہور میں رہ کر تیا دلہ آبادی کے عملی تصور کو جھٹلا دوں گا میری ضد میں انفرادی تڑپ ہے لیکن اس کے پیچھے ایک اجتماعی احساس بھی تو کار فرما ہے۔

("چھٹا دریا" از فکر تونسوی)

فکر لاہور کے قیام کے زمانے میں عجیب قسم کے ذہنی اور جذباتی بھونچال

گذر رہے تھے۔ اگرچہ یہ طے کرنا مشکل تھا کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ فکر امید و بیم کے دوراہے پر کھڑے ہوئے تھے اور انھیں یہ ڈر تھا کہ "دیر و حرم" کی اس کشمکش میں وہ کہیں اپنے گھر کا راستہ نہ بھول جائیں وہ اس وقت یگانہ چنگیزی کے اس شعر کی جیتی جاگتی تصویر بنے ہوئے تھے۔

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

لیکن فکر کے اندر کا انسان پوری طرح بیدار تھا، جاگ رہا تھا، اپنے اور انسانیت کے تحفظ کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا۔ یہاں پہنچ کر فکر نے یہی طے کیا کہ "انسان کی خدمت انسانیت کی خدمت ہے" اور یہی خدمت زندگی میں اہمیت کے لائق ہے اس خدمت کو کہیں بھی کسی صورت میں بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔ جب جبینوں میں سجدے تڑپ رہے ہوں تو مسجد اور مندر کی تفریق بے معنی بن جاتی ہے۔ زندگی کی جدو جہد فکر کا مطمح نظر بن گئی۔ فکر بتاتے ہیں کہ کس طرح سے آخر میں یہی طے کیا کہ اب انھیں زندگی اور اپنی زندگی کی جدو جہد کا ممبر بن جانا چاہیئے۔ کامریڈ منصور کی نگاہوں میں فکر کا دل بول رہا تھا:

"شاعر یا رٹی کا ممبر بن جانے سے کچھ نہیں بنے گا،
زندگی اور اس کی جدو جہد کا ممبر بن جاؤ۔ یہاں ممبری
عیاشی اور فیشن کی خاطر نہیں کی جاتی بلکہ زندگی کی
جدو جہد کے اندر کودنے والے کے اندر زندگی کا لمس
محسوس کرنے والے کی روح میں وہ سپیدی خود بہ خود

پیدا ہو جاتی ہے جسے تم ممبری سمجھتے ہو۔ اٹھو اٹھو کود جاؤ۔ اس نئی زندگی میں، اس نئے طوفان میں یہ طوفان جو زندگی کو ایک فیصلہ کن سکون اور مسرت اور محبت عطا کرے گا۔ ابدی آخری اور مسلسل"۔

(چھٹا دریا صفحہ ۱۴۴)

لاہور کے قیام کے دوران فکر جس کش مکش سے گذر رہے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دیر و حرم دونوں کی کشمکش سے الگ ہونا ضروری سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔ فکر اصل میں یہ محسوس کر رہے تھے کہ ہندوستان یا پاکستان میں اہم کام انسانیت کی بقاء اس کا تحفظ اس کی ترقی اور اس کا حصول زندگی کا سب سے اونچا سب سے بڑا اور سب سے اہم آدرش ہو سکتا ہے۔ اس وقت کے حالات میں فکر یہ محسوس کرتے تھے کہ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو کر اشتراکیت کی تبلیغ کے ذریعہ انسان اور انسانیت کی خدمت کی جا سکتی ہے۔ اور جب مطمح نظر انسان اور انسانیت کی خدمت ہے تو پھر یہ ہندوستان جا کر بھی ممکن ہے اور پاکستان میں رہ کر بھی۔ لیکن فکر اس وقت کے حالات سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ پاکستان میں رہ کر نہ وہ انسانیت کی کوئی خدمت انجام دے سکتے ہیں اور نہ ہی پارٹی کے کام کو آگے بڑھا سکتے ہیں کیونکہ پارٹی کی تبلیغ اور اشاعت کے کام میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کا ہندو ہونا بن سکتا تھا۔ کیونکہ پاکستان میں رہ کر اگر فکر کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو جاتے، تب بھی وہ پارٹی کے لیے کچھ نہ کر سکتے۔ اس لیے کہ ان کا ہندو ہونا مختلف تعصبات کو ہوا دینے کے لیے

کافی تھا اور صرف اس بنا پر کہ وہ ہندو ہیں بہت سے ایسے مسلمان جو تعصبات کی جال میں گرفتار تھے صرف انہی سے نہیں بلکہ خود پارٹی اور اس کے کام سے بدظن ہو جاتے۔ اسی وجہ سے آخر میں فکر نے یہی طے کیا کہ انہیں پاکستان چھوڑ دینا چاہیے اور وہ جو کام کرنا چاہتے ہیں وہ ہندوستان میں رہ کر زیادہ بہتر طریقہ پر زیادہ وسیع پیمانہ پر اور زیادہ موثر طور پر کیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعد میں فکر تذبذب کی حالت سے نکل آئے اور ان کے سامنے ایک واضح مقصد اور نصب العین آگیا وہ اپنی اس کیفیت کو یوں ظاہر کرتے ہیں۔

میری لاہور چھوڑنے کی خواہش پھر تیز ہو گئی ہے لیکن
اب اس خواہش کے پس منظر میں نہ تو ضد ہے اور نہ
جھلاہٹ اور نہ گھبراہٹ اور نہ فراریت بلکہ ان سب
جذبوں کی تہوں کو چیرتی ہوئی ایک چمکیلی سی لکیر ابھر آئی ہے

(چھٹا دریا ص۱۴۲)

اس امید کے سہارے یا امید کی کرن کے سہارے فکر نے پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اپنے دوستوں کی مدد سے یہی دوست جن کے ساتھ فکر لاہور کی گلی کوچوں میں آگ اور خون کی ہولی کھیلے جاتے وقت وہ ساتھ رہتے تھے۔ عبد المتین عارف، قتیل شفائی اور ممتاز مفتی کی مدد سے وہ پاکستان سے ہندوستان آگئے۔ پاکستان سے یا لاہور سے ہندوستان آنے کا فیصلہ فکر کی زندگی کا بڑا اہم موڑ تھا۔ فکر ان لوگوں میں سے ہیں جو ہندوستان اور پاکستان کی آزادی سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے کیونکہ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ آزادی کا سویرا اپنے ساتھ اس روشنی کو نہیں لا سکا

ہے جس کا خیال لے کر اور اس کے لیے محبانِ وطن نے تن من دھن کی بازی لگا دی تھی وہ فیض احمد فیض کے الفاظ میں یہ محسوس کر رہے تھے کہ ابھی آزادی کا اجالا داغ داغ ہے اور آزادی کی شب گزیدہ ہے اس لیے فکر بھی اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ابھی منزل تک آنے کے لیے اور چلنا ہے اور جد و جہد کرنا ہے اس لیے وہ چھٹے دریا میں لکھتے ہیں۔

"کہاں ہے مستقبل کہاں ہے صبح، کہاں ہے آزادی
کہاں ہے، آؤ اور دوستو ہمیں ایک زبردست دھوکہ دیا
گیا ہے۔ ہماری تلاش، جستجو اور جد و جہد کو منجمد کر دیا
گیا ہے۔ آؤ آؤ، یہ وہ صبح نہیں ہے۔ یہ وہ مقام نہیں
جس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم یہاں تک آ پہنچے تھے،
—— آؤ پھر آگے چلیں —— آگے اور آگے —— اور
آگے۔"

یہ آگے جانے کی خواہش یہ آگے بڑھنے کا ولولہ اس لیے تھا کہ فکر بھی یہ بات شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ آزادی کی وہ برکتیں جو پورے سماج کے لیے ہوتی ہیں وہ ابھی نہیں آئی ہیں۔ ابھی ہندوستان کے باشندوں میں وہ شعور اور وہ احساس ذمہ داری پیدا نہیں ہوا ہے جو کسی بھی آزاد ملک کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ ابھی ہندوستان یا پاکستان اپنے بنیادی مسائل ہی کو حل کرنے کے قابل نہیں ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ اپنی ڈائری چھٹے دریا کے آخر میں لکھتے ہیں کہ۔

آج ہمارے سامنے پھر سے نئے دھندلکے نئے استبداد

کھڑے کردیئے گئے ہیں آؤ انہیں چیر جائیں انھیں پھاند جائیں اور اس صبح کے نقش قدم ڈھونڈیں جس کے عکس تین سو سال سے ہمارے ہمارے دلوں کے نہاں خانوں میں لہراتے رہے ہیں۔ ہجوم بدستور نعرے لگا رہا تھا۔ ہم دوالی نہیں منائیں گے۔ ہمیں روٹی دو — ہمیں مکان دو۔ ہم دیوالی نہیں منائیں گے۔"

یہاں ان باتوں سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ فکر کی زندگی میں تقسیم کا سانحہ ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے اور فکر کی طنز نگاری کے پیچھے ان کی شخصی زندگی کے یہی واقعات اس شدت سے کام کر رہے ہیں اور ان کی شخصی زندگی پر ان واقعات کے ایسے دور رس اثرات مرتب ہوئے ہیں کہ آج ان کا پورا زور قلم آزادی کے ساتھ جو ناانصافیاں اور سماجی، سیاسی خرابیاں بھی در آئی تھیں، ان کی اصلاح ہو سکے۔ جیسے کہ کہا جا چکا ہے فکر ۱۹۴۷ء کے اس سانحہ کے بعد کمیونزم کی طرف راغب ہو گئے تھے اور وہ اب اشتراکیت میں ہندوستان اور پاکستان کی نجات دیکھ رہے تھے اور اشتراکی تعلیمات ہی کو پھیلانے اور آگے بڑھانے کے لیے انھوں نے پاکستان کے قیام کو ترک کیا۔ حالانکہ لاہور یا پاکستان سے فکر کی کئی جذباتی وابستگیاں تھیں۔ ان کی زندگی کا خوش گوار دور لاہور ہی کے قیام سے شروع ہوا تھا۔ ان کی شادی بھی یہیں کے دوران قیام میں ہوئی تھی۔ ان کے عزیز ترین دوست یہیں تھے جنہوں نے سرد و گرم میں ان کا ساتھ دے کر اپنی دوستی اور خلوص کا محکم ثبوت فراہم کیا تھا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز بھی ایک طرح سے یہیں

سے شروع ہوا تھا۔ باقاعدہ طور پر ادب سے وابستگی یقیناً لاہور کے قیام کی دین تھی۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتیں اپنی پوری شدت اور آب و تاب کے ساتھ یہیں جلوہ ریز ہوئی تھیں اور یہیں ان کا پہلا مجموعہ کلام "ہیولے" زیور طباعت سے آراستہ ہوا تھا۔ ان تمام وابستگیوں کو ان تمام علائق کو ان سارے بندھنوں کو ایک ہی جھٹکے میں توڑ کر پاکستان سے ہندوستان منتقل ہونا فکر کے لیے جس قدر شاق ہوا ہوگا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن فکر کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو اور وصف یہ ہے کہ وہ مستقبل سے ناامید نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ مستقبل پر نگاہیں رکھتے ہیں۔ اور تاریک ترین ماضی اور حال میں بھی مستقبل کی موہوم روشنی کو ہی مشعل راہ بنا لیتے ہیں۔ ان کی طبیعت کی یہہ رجائیت ہی انھیں طنز نگار بناتی ہے اور یہی اُمید ہے اور امید پر یہی بھروسہ ہے جس کے سہارے اور جس کی خاطر فکر اپنی روشنائی خیال صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے ہیں اور آج بھی ان کا قلم اس امید کے سہارے چل رہا ہے۔

فکر ہندوستان میں:

اب فکر پاکستان سے ہندوستان منتقل ہو گئے ہیں۔ یہاں آنے کے بعد انھوں نے ایک نئے عزم و ارادہ کے ساتھ اور انسانیت کی خدمت کے لیے ملک اور قوم کی خدمت کے لیے کمیونسٹ پارٹی سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ فکر اشتراکی خیالات لے کر ہی بلکہ اشتراکیت کے لیے ہی پاکستان سے ہندوستان منتقل ہوئے تھے۔ یہاں آکر بھی ان کی ادبی مصروفیت برابر جاری رہی فکر حقیقی معنوں میں "قلم کے مزدور" ہیں ان کا ذریعہ معاش ہمیشہ ان کی

ادبی مصروفیت، ادبی سرگرمیاں اور قلم کاری رہی ہے۔ فکر جب ہندوستان آئے تو مخمور جالندھری کے ساتھ مل کر مختلف پرچے اپنی ادارت میں جاری کیے۔ لیکن ہر پرچہ جیسا کہ ہندوستان میں سنجیدہ اور ادبی پرچوں کا حشر ہوتا ہے بے وقت موت کا شکار ہوتے ہیں۔ انھوں نے جالندھر کے قیام کے دوران "ادبی میگزین" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ پھر اس کے بعد ایک کے بعد دیگرے "رفتار" اور "نقوش" کے نام سے رسالے جاری کیے۔ یہ ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء کا زمانہ ہے لیکن یہ دونوں پرچے بھی زیادہ دن زندہ نہ رہ سکے اور اپنی موت آپ مرگئے۔

اس دوران میں فکر آل انڈیا ریڈیو جالندھر میں بھی "فری لانس اسکرپٹ رائٹر" کی حیثیت سے کام انجام دیتے رہے۔ ریڈیو کی ضرورت کے مطابق وہ مختلف موضوعات پر لکھتے رہے۔ فکر کی اس قلمی زرخیزی" کو دیکھ کر ریڈیو سے مستقل ملازمت کی پیشکش بھی کی گئی۔ لیکن فکر ہمیشہ ہی سے ملازمت کے طوق کو اپنے گلے میں پہننا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی فکر اور قلم کو ہمیشہ آزاد رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس کے برخلاف کمیونسٹ پارٹی کے لیے وہ مسلسل کام کرتے تھے اور اشتراکی خیالات اور تعلیمات کو حتی المقدور وہ اپنی تحریر میں جگہ دینے کی کوشش کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کی حکومت کی پالیسی کے خلاف یہ بات تھی اس وجہ سے وہ کام جو وقتاً فوقتاً ان کو ریڈیو سے ملا کرتا تھا وہ بھی کم کردیا گیا۔ بلکہ بالکلیہ طور پر بند کردیا گیا اور یوں فکر اپنے خیالات کی وجہ سے اور اپنے انداز فکر کی وجہ سے اس کے ذریعہ آمدنی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

فکر یہ چاہتے تھے کہ وہ باقاعدہ طور پر پارٹی کے پروگرام اور کام کو آگے

بڑھانے میں اپنا حصہ ادا کریں اس وجہ سے بعد میں باقاعدہ طور پر کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بن گئے۔ پارٹی سے وابستہ ہونے کے بعد فکر نے تونسوی تن دہی اور لگن

کے ساتھ پارٹی کے ادبی اور کلچرل محاذ پر کام کیا اور کئی طرح سے پارٹی کے کام اور پروگرام کو آگے بڑھانے کی کوشش کی، انھوں نے اس زمانے میں پنجابی اور اردو کی الگ الگ تنظیمیں قائم کیں، اور ان تنظیموں میں بڑا اہم اور سب سے نمایاں کام کیا۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں پنجاب سے دو مرتبہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی آل انڈیا کانفرنس میں ڈیلیگشن لے کر شریک ہونے کا اعزاز حاصل رہا۔ دہلی میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہوئی تب بھی وہ بہ حیثیت ڈیلیگیٹ شریک رہے۔ اس کانفرنس میں جو ۱۹۵۳ء میں ہوئی تھی۔ ہندی اور اردو کے ادیبوں کے علاوہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے بڑے بڑے ادیب بھی اس میں شامل تھے۔ جن میں قابل ذکر ڈاکٹر سلامت اللہ، ڈاکٹر عبدالعلیم، رام ولاس شرما، ملک راج آنند پیش پیش تھے۔

اس دوران میں گو فکر کا زیادہ تر قیام پنجاب ہی میں رہا لیکن وہ دہلی بھی آتے جاتے رہے ۱۹۵۲ء میں جب وہ دہلی آئے تو انھوں نے یہاں سے ایک نیم ادبی، نیم فلمی رسالہ کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ قیام دہلی میں بھی ترقی پسند ادبی حلقوں سے فکر مکمل طور پر وابستہ رہے اور بڑی سرگرمی سے ترقی پسند ادب کے لیے کام کرتے رہے۔ ہندوستان کے چوٹی کے اہل قلم سے فکر کا ربط قائم ہوا۔ اور یہ ربط و تعلق ہر لحاظ سے بار آور ثابت ہوا۔ جیسا کہ انھوں نے راقم الحروف کو ایک خط کے جواب میں لکھا کہ

"اردو کے بلند پایہ ادیبوں کی صحبت اور ملاقات سے میرے ادبی نصب العین کو مہمیز لگی"۔

۱۹۵۳ء میں فکر کو پھر دہلی سے پنجاب آجانا پڑا کیونکہ اس سال پنجاب کمیونسٹ پارٹی نے اپنا روزنامہ "نیا زمانہ" جالندھر سے جاری کیا تھا اور پارٹی کے منشار کے مطابق انہیں کام کرنا تھا۔

طنزیہ کالم نگاری:

نیا زمانہ میں فکر پہلی مرتبہ ایک طنزیہ کالم "آج کی خبر" کے عنوان سے روزانہ لکھنے لگے۔ فکر کے اس کالم کو بے حد مقبولیت حاصل ہوی۔ اور عوام وخواص دونوں میں یہ کالم بڑے شوق و اشتیاق سے پڑھا جاتا تھا۔ پنجاب اور دہلی کے اخباری ماحول میں فکر کے الفاظ میں "ایک نیا دھماکہ ثابت ہوا" یہیں سے فکر کی طنزیہ کالم نگاری کا باقاعدہ طور پر آغاز ہوتا ہے۔

۱۹۵۵ء میں نیا زمانہ بند ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح سے کمیونسٹ پارٹی سے فکر کا باقاعدہ ربط ٹوٹ گیا۔ اس طرح سے کوئی تین سال تک کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم ممبر کی حیثیت سے مختلف محاذوں پر کام کرتے رہے۔ جب پارٹی سے یہ ربط ختم ہوا تو پھر فکر کو ذریعہ معاش کی فکر دامن گیر ہوی اور ۱۹۵۵ء ہی میں ان کو بطور کالم نگار کام کرنے کا موقع حاصل ہوا۔ نیا زمانہ میں ان کا کالم (آج کی خبر) اتنا مشہور و مقبول ہو چکا تھا کہ "روزنامہ ملاپ" کے انتظامیہ نے بھی فکر کی اس غیر معمولی صلاحیت اور کامیابی سے استفادہ

کرنا مناسب سمجھا۔ ۱۹۵۵ء سے "پیاز کے چھلکے" کے عنوان سے فکر اپنا طنزیہ کالم لکھ رہے تھے۔ فکر کے اس کالم کو جیسی اور جتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اس کا جواب اُردو کی پوری کالم نویسی کی تاریخ میں ملنا ناممکن ہے۔ گویا پچیس سال سے زیادہ کے عرصہ سے مسلسل فکر اس کالم کو لکھ رہے ہیں۔ اور وہ کالم ابھی نیا اور تازہ ہے اور آج بھی بڑے شوق و اشتیاق سے پڑھا جا رہا ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے فکر حقیقی معنوں میں "قلم مزدور" ہیں ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ ان کا قلم رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملاپ کی اس کالم نویسی کے ساتھ ساتھ فکر دوسرے رسالوں میں بھی لکھتے رہے ہیں۔ ملاپ کی اس کالم نگاری کی مقبولیت کے بعد "بیسویں صدی" میں بھی لکھنے کا پیش کش انھیں کیا گیا اور بیسویں صدی میں بھی وہ گذشتہ ۲۰ سال سے متواتر اور مسلسل لکھ رہے ہیں اور اپنے زورِ قلم کے ذریعہ سماجی اور سیاسی مسائل کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بناکر اس میں ایسی ادبی چاشنی پیدا کرتے ہیں کہ عوام و خواص دونوں ہی ان کے گرویدہ بن جاتے ہیں۔

بیسویں صدی اور ملاپ کے علاوہ بھی فکر کا زورِ قلم مختلف صورتوں میں صرف ہوتا ہے اور وہ اپنے نوک قلم کی باریک دھار کے ذریعہ صفحۂ قرطاس کا سینہ چیر کر اپنی آمدنی کے ان چھوٹے چھوٹے اور مختصر دفینوں کو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فکر نے اب تک سینکڑوں بلکہ لاکھوں صفحات قلم کی روشنائی سے منور کیے ہیں۔ اور یہ ایسی روشنی ہے جس سے انکے گھر کا چراغ جلتا ہے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو میں بھی اب تک لاتعداد ڈرامے، فیچرس اور مزاحیہ تقریریں لکھ چکے ہیں اور لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے ڈرامے اور ان کی تحریریں ہندوستان بھر کے مختلف ریڈیو

اسٹیشن سے بار بار براڈ کاسٹ کی جاتی ہیں۔ ان کے ڈرامے اور فیچرس کو جو مقبولیت حاصل ہوتی رہتی ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کے کئی ڈرامے کئی سال تک اور کئی بار ہندوستان کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوتے رہے ہیں۔ اس طرح جب سے ٹیلیویژن کا آغاز ہوا ہے اس کے لیے بھی فکر اپنے طنزیہ مضامین، ڈرامے اور فیچرس لکھا کرتے ہیں ٹیلی ویژن کے لیے لکھے گئے ان کی یہ نگارشات بھی بے حد پسند کی جاتی ہیں۔

فکر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے علاوہ تھیٹر کے لیے بھی ڈرامے لکھتے ہیں ان کے چار ڈرامے اب تک اسٹیج کیے جاچکے ہیں اور انھیں بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس وجہ سے یہ ڈرامے اب تک کئی کئی بار دہلی کی مختلف تھیٹرس میں اسٹیج کیے جاچکے ہیں۔ اس کے علاوہ فکر نے کئی ڈرامے دہلی کے مختلف کالجوں کے لیے لکھے ہیں۔ دہلی کی کلچرل انجمنوں نے بھی ان کے ڈراموں کو پیش کرکے دادو تحسین حاصل کی ہے۔

فکر کا زرخیز قلم مسلسل اور جس تیز رفتاری سے چلتا ہے اس کا جواب ہندو پاک کے کسی بھی دوسرے ادیب کے پاس ملنا مشکل ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اردو کے بہت کم ادیب ایسے ہیں جو صرف اپنے قلم کے ذریعہ اپنی آمدنی پیدا کرتے ہیں۔ فکر مسلسل لکھتے ہیں۔ ان کے رشحات قلم ہندوستان اور پاکستان کے تقریباً سب ہی رسالوں میں چھپتے ہیں۔ اب فکر کی طنز نگاری ہندی رسائل کا بھی اہم ذخیرہ بنتی جارہی ہے۔ ان کی مختلف تحریریں بڑی تیزی سے ہندی میں منتقل ہورہی ہیں اور وہ ہندی میں بھی مسلسل چھپ رہے ہیں۔ ہندی ادبی دنیا میں بھی فکر ہندی ہی کے مشہور طنز نگار سمجھے جاتے ہیں۔ ہندی میں

ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

فکر اپنے مستقل کالموں کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ ہمیشہ لکھتے رہتے ہیں۔ آج کل وہ اپنا سوانحی تذکرہ بعنوان "فکر بیتی" ناول کی صورت میں لکھنے میں مشغول ہیں۔ فکر بیتی اکتوبر ۱۹۷۵ء میں بیسویں صدی میں بالاقساط چھپ چکی ہے۔

فکر بحیثیت باپ :

فکر کا قیام آج کل دہلی میں ہے۔ تقریباً ۱۹۵۳ء سے انھوں نے دہلی ہی میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔ اب جبکہ فکر کی عمر باسٹھ سال کی ہو چکی ہے انھیں زندگی میں کسی قدر سکون میسر آگیا ہے۔ وہ اب بڑی حد تک خوش باش زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی بھی پرسکون ہے۔ ان کے تینوں بچے بھی اب معاشی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی لڑکی راج رانی انگریزی سے ایم۔ اے کر چکی ہے اور بی ٹی کا امتحان بھی پاس کرلیا ہے۔ دہلی کے ایک اسکول میں ٹیچر کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ راج رانی کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ انھیں ایک لڑکا ہے۔ اس لحاظ سے فکر نانا بھی بن چکے ہیں۔ راج رانی کے بعد فکر کو ایک لڑکا بھول کمار ہے۔ جو بی یس سی کرنے کے بعد دہلی کے ایک بنک میں ملازم ہے۔ فکر کی سب سے چھوٹی لڑکی سمن لتا بی اے کر چکی ہے اور وہ دہلی کے ایک سرکاری دفتر میں اسٹینو گرافر کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ اس طرح سے فکر وہ خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جن کے بچے اچھی تعلیم پاکر عملی زندگی میں اپنے قدم جما لیتے ہیں۔

انسان کی زندگی میں تین فکریں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور دراصل میں

زندگی کے یہ مرحلے بھی ہوا کرتے ہیں۔ سب سے پہلی فکر فکرِ معاش ہوا کرتی ہے دوسری فکر فکرِ ازدواج اور تیسری فکر اولاد کی ہوتی ہے۔ ان تینوں فکروں سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برا ہونا یقیناً زورِ بازو کی بات نہیں ہوا کرتی۔ فکر کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اب فکر ان تینوں اہم ترین فکروں سے بے فکر ہو چکے ہیں۔ اس طرح سے اب فکر صحیح معنوں میں صرف فکر رہ گئے ہیں۔ ورنہ یہ تینوں چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر شخص کو فکر بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ آدمی فکر بنے یا نہ بنے ان کی وجہ سے فکرمند ہو کر ضرور رہ جاتا ہے اور تفکرات کے جنجال میں ایسا پھنس جاتا ہے کہ کسی دوسری بات کی فکر کر ہی نہیں سکتا۔ لیکن فکر کو اب سب سے بڑی سہولت یہ حاصل ہو گئی ہے کہ وہ فکرمند ہونے کے دم چھلے سے بڑی حد تک نکل آئے ہیں اب ان کی فکر شعر و ادب کے لیے ہے ملک و قوم کے لیے ہے۔ گرتی ہوی سماجی، سیاسی قدروں کی اصلاح کے لیے ہے اور ملک و قوم کی معاشی و اقتصادی جد و جہد کے لیے ہے۔

فکر تونسوی کی طنز نگاری

شاعری

فکر آج طنز نگار کی حیثیت سے بے حد مشہور و معروف ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ فکر کرشن چندر کے الفاظ میں ایک عظیم طنز نگار ہیں۔ فکر اب پندرہ اُردو کتابوں کے اور چھ ہندی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ وہ پچیس سال سے روزانہ طنز و مزاح کا کالم لکھتے ہیں۔ بیسویں صدی میں بھی وہ گذشتہ بیس سال سے مسلسل لکھ رہے ہیں اس طرح اب تک سینکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات فکر نے لکھ ڈالے ہیں۔ یہ ہزاروں صفحات ان کی مختلف تصانیف سے الگ ہیں۔ ان تمام تصانیف کا اور ان کی تمام تحریروں کا محور ان کی طنز نگاری ہی ہے۔ فکر کی طنز نگاری کا آغاز جن حالات میں ہوا اور جس طرح ہوا اس کا ذکر آئندہ آئے گا۔ یہاں اس بات کا ذکر شائد بے جا نہ ہوگا کہ فکر بنیادی طور پر زندگی بھر "قلم کے مزدور" رہے ہیں۔ ان کی زندگی کے حالات میں اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ فکر کی ادبی زندگی کا آغاز مختلف رسالوں کی ادارت سے شروع ہوا تھا۔ ان رسالوں میں ماہنامہ ادب لطیف لاہور ماہنامہ سویرا لاہور

دو ماہی "تصویر" جالندھر، ہفتہ وار رفتار جالندھر، ماہنامہ شاہراہ دہلی جیسے موقر اور معیاری رسائل شامل تھے۔ فکر کی ادبی زندگی کی یہ شاندار اٹھان اس وقت اردو کی ادبی دنیا کے سامنے آئی جب کہ ان کی عمر صرف چوبیس پچیس سال تھی۔ فکر اس زمانے میں ایک کامیاب مدیر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور ایک مدت تک اردو ادب اس بات سے واقف نہیں ہوتا کہ ان کے اندر کتنا بڑا طنز نگار چھپا بیٹھا ہے۔ فکر کی اس ادبی زندگی میں مدیر کے علاوہ جو دوسرا روپ سامنے آتا ہے وہ ان کی شعر گوئی کا ہے۔ رام نارائن کو ان کے ادبی ذوق اور شعری صلاحیت نے فکر تونسوی بنا دیا ہے۔

رام نارائن فکر تونسوی کے روپ میں اُردو ادب کی شعری دنیا میں بڑی تیزی سے بڑا نام اور مقام پیدا کر لیتے ہیں، لیکن فکر شعری دنیا میں "شعلۂ مستعجل" ثابت ہوتے ہیں۔ شعر وادب کی دنیا میں "ان کی "خوشدرخشندگی" کو جنھوں نے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ فکر کتنے بڑے اور کیتنے اہم شاعر بن رہے تھے اور بن سکتے تھے۔ لیکن آج بہ حیثیت شاعر کے فکر کو جاننے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے۔ بلکہ ایک بہت بڑا طبقہ ایسا بھی ہے جو قطعی طور پر اس بات سے ناواقف ہے کہ فکر ایک زمانے میں اپنی فکر کی جولانی طبع شاعری کی دنیا میں بھی بڑے ٹھاٹھ سے دکھا چکے ہیں۔ آج ان کی شاعرانہ شخصیت میں سے صرف "فکر" باقی بچ رہا ہے اور ان کی پوری شاعرانہ شخصیت نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے۔

فکر کی شاعری کا آغاز بہت ہی کم عمری میں ہوتا ہے اور دوسرے شاعروں کی طرح ان کی شاعری کا آغاز بھی غزل گوئی سے ہوا تھا۔ اس بارے میں اپنی شاعری سے متعلق راقم الحروف کو اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

"شعر گوئی کا شوق اسکول میں ہی پیدا ہوا۔ غزل گوئی سے آغاز کیا، ادبی ماحول میسر نہ آنے کے باعث غزل گوئی پروان نہ چڑھ سکی۔"

(خط بہ نام راقم از فکر تونسوی)

فکر نے اپنی شاعری کی ابتدا میں جو غزلیں کہی تھیں وہ کہیں نہیں ملتیں نہ ہی فکر کو ان کی ابتدائی غزلوں کے اشعار یاد ہیں۔ دہلی میں فکر سے شخصی ملاقات کے دوران راقم الحروف نے جب ان کی غزل گوئی کے تعلق سے استفسار کیا تو ان کو اپنی کسی بھی غزل کا کوئی شعر یاد نہیں آرہا تھا، پھر راقم نے ان سے ان کی شاعری کے سب سے پہلے شعر کے بارے میں استفسار کرنے پر فکر نے اپنی شاعری کا پہلا شعر جو غزل کا تھا سنایا ؎

وہی تو غضب سے جیتا وہی میں ادب میں ہارا
ابھی تو نے روک رکھا ہے کہیں کوئی اک اشارا

فکر کے ابتدائی کلام کی جستجو میں راقم کو یہ پوری غزل ادب لطیف لاہور اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء میں ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں اس بات کا ذکر کرنا بھی شائد بے محل نہ ہوگا کہ فکر کا مجموعۂ کلام "ہیولے" کے نام سے سنہ ۱۹۴۷ء میں مکتبہ اردو لاہور سے چھپا ہے۔ لیکن آج مجموعۂ کلام کہیں بھی ملنا مشکل ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ خود "صاحب ہیولے" کے پاس بھی ہیولے نہیں ہے۔ راقم نے فکر تونسوی کو جب ہیولے کی بابت دو تین خطوط لکھے تب فکر نے یہ وعدہ کیا کہ مئی سنہ ۱۹۷۶ء میں ہونے والی کل ہند ادبی کانفرنس میں آتے وقت اپنے دوست کے پاس سے مانگ کر لاؤں گا۔ چنانچہ فکر ہی کی وساطت سے ہیولے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

ہیولے کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ یہی ان کی پہلی غزل اس میں بھی موجود ہے۔ فکر
کی یہ پہلی غزل یہاں پیش کی جاتی ہے۔ جو فکر کی غزل گوئی کی نمائندگی کرتی ہے۔

وہی تو غضب سے جیتا وہی میں ادب سے ہارا
ابھی تو نے روک رکھا ہے کہیں کوئی اک اشارا
تجھے بھا گئی ہیں کیونکر میری بے نماز نظریں
کہ امام شہر نے تو انہیں کفر گر پکارا
مرے جرم کے طریقوں نے غضب کیا ہے ورنہ
مری ہر خطا مسلم مجھے ہر سزا گوارا
مجھے کھوجنے کی جدت تجھے پردگی میں لذت
مجھے سوز غم نے لوٹا، تجھے کیف و کم نے مارا
ہے کوئی ازل کا شاہد جو یہ راز فاش کر دے
مجھے کس کڑے کلیجے نے زمین پر اتارا
مری راہ پر نہ آئیں، مری چاہ پر نہ جائیں
کہ ہیں قید وقت و منزل میں ابھی نہو ستارا
تری شعبدہ پسندی سے نباہ رہا ہوں اب تک
کبھی کھو گیا سمندر، کبھی کھو گیا کنارا

ہیولے میں فکر کی چند غزلیں اور ملتی ہیں جن میں سے چند ایک منتخب
اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

تو پاس آ بھی نہیں سکتا ترا گلا بھی نہیں
تجھے بھلا نہیں سکتا میری خطا بھی نہیں

زمانے بھر کے لیے دل مرا برا ہی سہی
تری قسم ہے کچھ ایسا مگر برا بھی نہیں

ہارے ہوئے کھلاڑی پانسے بدل رہے ہیں
بر فاب کے لبوں سے لوکے نکل رہے ہیں

بڑھتا ہوا ارا ہی میں ہٹتی ہوئی منزل تو
تیری بھی ہوسنا کی، میری بھی ہوسنا کی

اک حوصلے کی جست باندازِ براہیم
اور ہونے لگے فاش مشیت کا ارادہ
احساس تخیل کی پلٹتی ہوئی آواز
پرواز کے کونین کشادہ ہے کشادہ

ان خاک کے ذرّوں پہ ہے دامانِ حرم تنگ
خود مٹ کے جو کرتے رہے تعمیرِ دلِ سنگ

بنا چکا مری تقدیر کے وہ جب نقشے
نہ جانے رو دیا کیوں مجھ پہ نقش کارِ مرا

نکھار سکتا ہے تیرے جمال سادا کو
وہ غم کا گیت جو تو نے ابھی سنا بھی نہیں

فکر کی غزلوں کے ان چند اشعار ہی سے انداز فکر کی جدّت صاف طور پر نمایاں نظر آتی ہے فکر غزل گوئی میں بھی پامال اور روندھی ہوی روشوں سے بچ کر چلنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ یہاں چند ایک ترکیبوں کی جدّت، انداز فکر کی ندرت کو ظاہر کرتی ہے۔ جیسے "برقاب کے لب" "ذہن بہار" "حوصلہ کی جست" "تعمیر دل سنگ" یہ صرف چند اشعار ہی سے تراکیب چن کر پیش کی گئی ہیں۔ ایسے بہت سے تراکیب ان غزلوں اور نظموں میں ملتی ہیں۔ فکر اگر غزل گوئی کو جاری رکھتے تو وہ اپنا ایک علیحدہ نمایاں اور نیا مقام بنا لیتے۔ ان کی ان غزلوں میں ایک نئی شگفتگی اور تازگی کا احساس ملتا ہے لیکن افسوس کہ فکر نے بہت جلد غزل گوئی ترک کر دی۔ انھوں نے غزل گوئی کیوں اور کن حالات میں ترک کی اس کا ذکر راقم کو اپنے ایک خط میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"اقتصادی جد و جہد کے دوران نظم گوئی کی طرف رجحان مبذول ہو گیا۔ مزاج میں تغزل نہیں تھا۔"

(خط بہ نام راقم۔ از فکر تونسوی)

یہاں یہ بات تو کسی حد تک سمجھ میں آتی ہے کہ فکر کو زندگی کے نشیب و فراز نے اس بات کا موقع نہیں دیا کہ وہ غزل سرائی کر سکیں۔ محبت کے سوا زمانے کے اور بھی دکھ ایسے ہوتے ہیں جو خیال و توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں۔ جب دمشق میں قحط پڑا تھا تو لوگ عشق کرنا بھول گئے تھے۔ اگر فکر بھی زندگی کے بکھیڑوں میں غزل گوئی ترک کرتے

ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن یہاں فکر کے اس خیال کو کسی طرح بھی اور شاید کوئی بھی اتفاق نہ کرلے ان کے مزاج میں تغزل نہیں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ فکر یہاں تغزل کو محدود معنوں میں استعمال کر رہے ہوں ورنہ غزل گوئی سے ان کی فطرت کو جو مناسبت تھی اس کو ثابت کرنے کے لیے مندرجہ بالا غزل اور غزلوں کے مذکورہ منتخب اشعار بھی کافی ہیں۔

فکر غزل گوئی سے نظم نگاری کی طرف بہر حال اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں اور اس "انتقال فکر" کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ اقتصادی جدوجہد نے ان کے فکر و خیال کو نظم گوئی کی طرف مبذول کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اقتصادی الجھنوں میں گرفتار ہو کر فکر نے جو شاعری کی وہ عشقیہ کسی صورت میں نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے ان کی شاعری میں اور خاص طور پر نظم گوئی میں غمِ جاناں کے بجائے غمِ دوراں کی شدت نظر آتی ہے۔ فکر نے اپنی پہلی ہی نظم کے ذریعہ ادبی دنیا میں ایک طرح سے تہلکہ مچا دیا تھا۔ ان کی پہلی نظم "تنہائی" ہے جو انھوں نے سنہ ۱۹۴۲ء میں لکھی تھی۔ یہ نظم جس طرح سے "ادبی دنیا" کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے فکر راقم کے نام ایک خط میں رقم طراز ہیں۔

"پہلی مرتبہ لاہور کے بلند پایہ ادبی رسالہ "ادبی دنیا" میں میں ایک نظم تنہائی ارسال کی، جس کے ایڈیٹر مولانا صلاح الدین تھے۔ وہ نظم نہ صرف ٹھاٹھ سے شائع کی گئی بلکہ سال کی بہترین نظموں میں شمار کی گئی۔ لاہور کا مشہور ادبی حلقہ "حلقۂ ارباب ذوق" ہر سال سال بھر کی بہترین نظموں کا ایک مجموعہ شائع کرتا تھا، میری نظم کو بھی اس

مجموعے میں شامل کیا گیا اور حلقہ کے سالانہ ادبی جلسہ
میں مدعو کیا گیا جہاں یہ نظم پڑھ کر سنائی گئی۔"
(خط بہ نام راقم از فکر تونسوی)

فکر کی پہلی نظم تنہائی پیشِ خدمت ہے۔

دور جہاں کے ہنگاموں سے،
سونی سونی ہے اک وادی
بنجر راہیں سنسان ٹیلے
کالی گہری لمبی درزیں
آگے پیچھے دائیں بائیں
مایوسی کی لہریں گائیں
غم کے جھولے میں لہرائے
ایک مسلسل سائیں سائیں
چرمر چرمر کرتے جائیں
رومانی تخیل کے ڈھانچے
لاکھوں ہلکی ہلکی نیندیں
ایسے آئیں ایسے جائیں
بادل کے پردے کے پیچھے
چاند کی آنکھ مچولی جیسے
آہوں کی یہ طوفاں خیزی
ہانپ گیا تنہا فریادی

دور جہاں کے ہنگاموں سے

سونی سونی ہے اک وادی

اس طرح سنہ ۱۹۴۲ء سے فکر کی نظم گوئی شروع ہوتی ہے اور اس کا سلسلہ سنہ ۱۹۴۹ء تک چلتا ہے۔ اس پورے عرصہ میں فکر نے صرف نظمیں ہی کہی ہیں۔ یہ نظمیں اس وقت چوٹی کے ادبی رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکی تھیں۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں فکر کا مجموعۂ کلام ہیولے کے نام سے چھپا۔ یہ مجموعہ اتحاد پریس لاہور میں چودھری برکت علی کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا۔ اس میں چند غزلوں کے علاوہ کوئی اکتالیس نظمیں شامل ہیں۔ فکر نے یہ کتاب اپنے عزیز دوست پاکستان کے مشہور افسانہ نگار اور ادیب ممتاز مفتی کے نام معنون کی ہے۔

ہیولے میں جو نظمیں شریکِ اشاعت کی ہیں ان سب کے عنوانات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ ان عنوانات ہی سے فکر کی شاعری پر اور ان کے انداز فکر پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

مہاگیانی، کن، پھر بھی، تب اور اب، بغاوت، اجنبی مجسمہ، بیاہ، دو جواب، بے ٹھکانہ، بلاوے، چھکڑے، دھواں، اپنی پوجا، بچھڑا، ہوا گھر، نیند، تنہائی، واپس، سوئمبر، راستہ، راستہ، مشورہ، اولین موت، شکنتلا، برہما چاری، جاؤ کہہ دو، معبود، زندانِ ہراس، اور ظلمت نے کہا، ناتمامی، افسوں انتظار، خلوص، ایک کہانی، وہی پرانی ریت، عمل رد عمل، ارتقاء، پچھتاوا، جینیس، وہاں سے یہاں تک، مراجعت، اخلاق، احتجاج، میرے عوام، حوا کی بیٹی۔

فکر نے سنہ ۱۹۴۹ء میں شاعری ترک کر دی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی بتایا کہ ان کی شاعری غم ذات تک محدود تھی۔ لیکن مجموعی طور پر فکر کی شاعری کسی طرح بھی غم ذات تک اسیر یا محدود کہی نہیں جا سکتی۔ فکر ابتدا ہی سے صرف اپنی ذات ہی نہیں بلکہ اپنے اطراف کی ساری انسانیت کو دیکھ رہے تھے اور اپنے ملک وقوم کے مسائل کا جائزہ بڑی ہمدردی اور محبت سے لے رہے تھے۔ اس مطالعہ کے دوران، وہ یہ بات شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ ہندوستان کی حالت انسانیت کی حالت بڑی اصلاح طلب ہے اور اس کے لیے ہر انسان، ہر ادیب، ہر شاعر اور ہر فن کار کا یہ کام ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو صرف کرے۔ یہی جذبہ تھا کہ فکر غزل سے نظم کی طرف رجوع ہوئے۔ کیونکہ وہ بھی جگر کے الفاظ میں محسوس کرتے تھے۔

شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آج کل

اور یہی جذبہ ان کو شاعری سے طنز نگاری کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن خود ان کی شاعری میں بھی یہ جذبہ پوری طرح نمایاں ہے۔ فکر کے دوست اور ساتھی، کنہیا لال کپور ہیولے میں فکر کی شاعری میں طنز و مزاح کا عنصر جو ابتدا ہی سے کام کر رہا تھا اس کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"شیکسپیر کے ڈرامے میں پک کا ملکوتی کردار جو فضا میں پرواز کرتے ہوئے بنی آدم پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتا ہے اور طنز کے ملے جلے جذبات سے چیخ کر کہتا ہے یا خدا، انسان کتنا بے وقوف ہے، مجھے فکر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

ہیولے کا شاعر یک سے بڑی حد تک مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ وہ تخیل کی بلندیوں پر پرواز کرتے ہوئے بار بار چلا اٹھتا ہے "اے آدم و حوّا کے فرزندو تم کتنے عجیب ہو"
("ہیولے" مجموعۂ کلام فکر تونسوی مطبوعہ مکتبہ اردو لاہور ۱۹۴۷ئ)

ہیولے کی پہلی ہی نظم "مہاگیانی" میں انھوں نے دیوتاؤں پر اور ان کے پجاریوں پر طنز کیا ہے۔ فکر اپنی اس نظم میں یہ بتاتے ہیں کہ کس طرح سے مذہب کی آڑ لے کر انسانیت میں تفرقہ پردازی کی جاتی ہے۔ اس نظم کے یہ آخری چند مصرعے فکر نے اپنی نظم میں جو طنز کیا ہے وہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے

منو مہاراج تیری روح معظم کو سلام
شعبدہ باز ترے سحر منظم کو سلام
تیری ادراک کے ہر پیچ کو ہر خم کو سلام
تری اس تفرقہ پردازیٔ آدم کو سلام

اس طرح ان کی دوسری نظم جس میں انھوں نے اپنے اس طنز سے کام لے کر جو بات پوری شدت سے ظاہر کر دی ہے کہ ایک عام آدمی کو اس بات کی اجازت ہی نہیں دی جاتی کہ وہ اپنی تمنا کو ظاہر کرے۔ ایسی کوئی تمنا ہر شہنشاہ معظم کو ناگوار گزرتی ہے۔ فکر کی نظم "شکنتلا" کالی داس کے ڈرامے "شکنتلا" کو ذہن میں رکھ کر اگر پڑھی جائے تو اس نظم کے آخری حصہ میں فکر نے جو گہرا اور تیکھا طنز کیا ہے وہ پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔

اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ فکر کا طنز کسی بھی ناانصافی کے خلاف ابتدا ہی سے بڑی شدت سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی نظم "شکنتلا" کے آخری چند مصرعے

ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

اسے دیوار میں چنوا دو اسے سنگسار کرو
اسے نیزوں پہ اچھا دو اسے چھلنی کر دو
دھڑ دھڑاتے ہوئے شعلوں میں جھلس دو اسکو
ہڈیاں پیس دو کتوں سے اسے نچوا دو
اس نے توہین شہنشاہ معظم کی ہے
ایک ذرہ نے تمنائے دو عالم کی ہے

(ہیولے ص۶۵)

اس طرح ان کی نظم (برہماچاری) میں بھی ان کا طنز پوری شدت سے ابھر آیا ہے۔ ان تمام نظموں میں فکر کی جدّت فکر اور ان کا انفرادی نقطۂ نظر بے حد واضح ہے۔ وہ اپنے طور پر ہر چیز کو دیکھتے ہیں پرکھتے ہیں۔ اور اس کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ فکر روایت پرستی اور اندھی تقلید کو کہیں بھی اور کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے طور پر مذہبی باتوں کی بھی ترجمانی کرتے ہیں اور اس کو نیا رنگ روپ دیتے ہیں۔ فکر کی اس خصوصیت کا اظہار کرتے ہوئے کنہیا لال کپور لکھتے ہیں :۔

" فکر کی شاعری کا ایک اہم پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ وہ واحد شاعر ہے جس نے ہندو دیو مالا کو جدید حیران کن اور منفرد زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہندو دیو مالا سے اس کا یہ سلوک روایات سے ہٹ کر انفرادی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ جیسے شکنتلا ، برہماچاری اور

مہاگیانی ہیں؛"

(ہیولے۔ مقدمہ کنہیالال کپور ص۱۴)

فکر کا یہ منفرد انداز انھیں خدا سے بھی گستاخیاں کرنے پر مجبور کرتا ہے جس سے ان کے اشتراکی ہونے کا بھی پورا پورا ثبوت ملتا ہے۔ وہ موجودہ دنیا اور اس کے کاروبار اور کارکردگی سے ایسے مایوس ہیں کہ وہ اپنے لیے ایک نیا خدا ڈھونڈھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی نظم "معبود" ان کی اس جستجو اور فکر کی بہترین غماز ہے۔ وہ اپنی نظم معبود میں یوں اظہار کرتے ہیں:

میرا معبود ابھی تک ہے دھندلکوں میں کہیں
کوئی تصویر بھی واضح نہیں آئینہ نہیں
کتنے ہی الجھے ہوئے پیچاں و بیکار خطوط
مرتسم ہیں مری ادراک کی پیشانی پر
صورتیں کتنی بدلتا ہے لکیروں کا جمال
کبھی مندر کبھی مسجد کبھی گنگا کبھی نیل
میرا معبود نہیں ان میں تو کوئی بھی نہیں
نیلگوں عرش کی رفعت میں کہیں مخفی ہے

اس طرح فکر اس خدا کے پرستار نہیں جو مختلف مقامات پر مقید ہوتا ہے یا مقید سمجھا جاتا ہے۔ پھر یہ کہ وہ چاہتے ہیں کہ خدائی میں کوئی بے انصافی نہ ہو۔ کوئی خرابی نہ ہو، جہاں انسان اور انسانیت ہر طرح اور ہر لحاظ سے محفوظ ہو کر فکر کی فکر ایسے ہی خدا کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی ہے اور یوں فکر کا خدا سے یہ انکار اثبات میں بدلتا نظر آتا ہے گویا خدا کے وہ قائل ہیں۔ یہ

اور بات ہے کہ ان کو اس کی جستجو بھی ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ خدا نیلگوں عرش کی رفعت میں کہیں مخفی ہے" اس وجہ سے بعض وقت خدا کو مشورہ بھی دیتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ جہاں بھی اس کی کائنات میں اندھیرا دیکھیں گے تو اس پر بگڑیں گے بھی۔ ان کی نظم "مشورہ" میں فکر کے یہ تیور دیکھے جا سکتے ہیں۔

تو مری سوچ پہ اے صاحب کونین نہ جا
ذہن سنگین سے تو بہتے ہی رہیں گے لاوے
تیرے شاہکار پہ ہنستے ہی رہیں گے شعلے
تیرے ہر پھول میں چبھتے ہی رہیں گے کانٹے
میں تیرے ذہن کی تخئیل دلاویز سہی
تیرے جلووں پہ اندھیروں پہ تو بگڑوں گا یونہی
تجھ سے الجھوں گا کہ اس رقص کا مفہوم ہے کیا
بڑی گستاخی سے کہدوں گا میں رب عالم
تیری بیگار تمنا کا نشانہ ہیں ہم
مجھے کہنے دے میرے کہنے میں رکھا کیا ہے
بے نتیجہ ہے تو کیا بلبل و آہنگ و بہار
بے سحر ہے یہ شب دہر تو پرواہ کیا ہے
تو بجلائے ہی چلا جا یہ اشاروں کا ستار
اور میری سوچ پہ اے صاحب کونین نہ جا

(ہیولے۔ ص ۶۱)

فکر کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کنہیالال کپور لکھتے ہیں

"وہ خدا کو قوت اعلیٰ کو "بازی گر کونین" کے عجیب و غریب لقب سے
یاد کرتا ہے۔"

(ہیولے - مقدمہ کنہیا لال کپور - ص۱۰)

اور آگے چل کر انھوں نے لکھا ہے کہ۔

"وہ صرف خدا ہی کو نہیں بلکہ اپنے گرد و پیش کے انسانوں
کو معاف نہیں کرتا۔

(ہیولے ص۱۰)

فکر کی شاعری میں اسی وجہ سے ایک مایوسی کی فضا ملتی ہے
کیونکہ وہ خدا سے مطمئن ہیں نہ انسانوں سے وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ دنیا
اور اس کے سارے مذاہب بے کار اور بے نتیجہ ہیں۔ اس لیے کہ ان میں جو
تعمیری قوت ہونا چاہیے وہ مفقود ہے۔ فکر کی شاعری کے اس رجحان
کو نمایاں کرتے ہوئے کنہیا لال کپور نے لکھا ہے کہ:

"جو قاری مطالعہ کے تفریحی پہلو کے خوگر ہیں ان کو
فکر کی شاعری میں ایک خوف ناک یاسیت اور کڑوی
کسیلی قنوطیت کا احساس ہوگا۔ کیونکہ وہ لبما اوقات
اتنا قنوطی ہو جاتا ہے کہ مشہور فلاسفر دیو جانس،
شوپن ہار اور ٹامس ہارڈی سے دوسرے درجہ پر دکھائی
دیتا ہے۔"

(ہیولے ص۱۳)

ان کی اس قنوطیت کی ادعان کے اس انداز فکر کی بہت سی پر

نمائندگی ، ان کی نظم "جینیس" سے ہوتی ہے۔ جینیس ان کی نظموں میں اور خود فکر کے کہنے کے مطابق بھی شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ یہاں پوری کی پوری نظم دی جا رہی ہے جس سے نہ صرف فکر کی فکر پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ان کا انداز بیان طرز اظہار اور اسلوب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

میں صدیوں سے تنہا چلا آ رہا ہوں
میں صدیوں سے غول بیاباں کے زنداں میں گھرا رہا ہوں
میں خاموش ہوں جیسے معبد کے گوشہ میں کوئی بت استادہ
ہونٹ پر مری اپنی ہی عظمت کی مہریں لگی ہیں
یہ کونین پر کیوں مسلط ہے اک ہُو کا عالم
یہ سہمی ستارے میں یا چاند نے اپنی تنہائیوں پر بہائے ہیں آنسو
ہوا کی بُری سانس روکے پروں کو سمیٹے ہوئے تھم گئی ہے
میرے گرد لاکھوں صدائیں بگولہ صفت گھومتی ہیں۔
ابھارے چلی جا رہی ہیں مرے گرد زنداں کی سنگین فصیلیں
بڑھائے چلی جا رہی ہیں مرے دل کی سنسانیوں کو
میں تنہا ہوا جا رہا ہوں
مرا غم تمہارے تحیر کے بس کا نہیں ہے
نکلنے دو مجھ کو بگولوں کے زنداں میں دم گھٹ رہا ہے
یہ اک چپکا چپکا تبسم جو میرے لبوں پر ابھرتا رہا ہے تبسم نہیں ہے۔
گو یوں بھی مری چشم عظمت نے آنسو بہائے
یہ آنسو یہ طنز مسلسل کہاں تک مرا ساتھ دیں گے۔

کہاں تک میں یوں اپنے اوپر ستم ڈھا سکوں گا
کہاں تک تمہارے لیئے خود کو بہلا سکوں گا
کہ میری صدا جو بتِ خاموش بن گئی ہے
اسے چاند تاروں، بہاروں سے نسبت رہی ہے
تمہاری صداؤں میں کیا مل سکے گی، تمہاری نہیں یہ تمہاری نہیں ہے۔
تمہارے تحیر کو میں چھوڑ جاؤں گا زنداں کے در پر
نکلنے دو مجھ کو۔۔۔ ستاروں بہاروں سے ملنے دو مجھ کو
میں گھبرا رہا ہوں ـــــ میں تنہا ہوا جا رہا ہوں
میں تنہا نہیں رہ سکوں گا۔۔۔"

(ہیولے)

فکر اپنا ایک علیحدہ اور انفرادی اسلوب رکھتے ہیں۔ فکر کا اسلوب اور ان کی اس خصوصیت ایر روشنی ڈالتے ہوئے کنہیا لال کپور لکھتے ہیں۔

"ہر عظیم فن کار کی طرح فکر بھی صاحب اسلوب شاعر ہے۔ اس کا طرز اظہار منفرد اور ایک خاص قسم کا عُجب لیے ہوئے ہے۔۔۔۔۔ وہ اپنے اسلوب بیان میں الفاظ کی جدت اور تازگی میں نئی تراکیب میں تشبیہوں کی ندرت میں بے مثال چابک دستی رکھتا ہے۔۔۔۔۔

(ہیولے۔ مقدمہ کنہیا لال کپور صـ ۱۴)

آگے چل کر فکر کے پاس یہ جدت ادا کس طرح آئی ہے اس کی فصاحت کرتے ہوئے کنہیا لال کپور لکھتے ہیں کہ:

"میرے خیال میں فکر اسی قسم کا شاعر ہے جو ایک نئی اور ایک اچھوتی بات کہنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے ایک نیا اور اچھوتا اسلوب اختیار کیا ہے اور یہ اسلوب فنی دیانت کی دلیل ہے اگرچہ اس نے بات کے اظہار کے لیے صنف شعر کو منتخب کیا ہے۔ ایک پرانی چیز ہے۔ لیکن وہ اس میں بھی رسومات کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے۔"

(ھیولے ص۱۸)

فکر کا یہی منفرد اسلوب اور طرز بیان ان کو اردو شاعری میں ایک معتبر جگہ دیتا ہے۔ راقم الحروف کو ڈاکٹر مغنی تبسم نے ایک ملاقات میں فکر کی شاعری کی اس خصوصیت کو ظاہر کرتے کہا کہ "فکر کی شاعری میں ایسی اچھوتی اور خوب صورت و نادر تراکیب اور استعارے ملتے ہیں جو اردو کے گنے چنے شاعروں کے پاس ہی نظر آتے ہیں"۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تراکیب ایسی منفرد اور اچھوتی ہیں کہ وہ کسی دوسرے چند ایک شعرا کے پاس ہی ملتی ہیں۔ جیسے "خورشید کی سٹریائیں، ابر کی سرمئی آنکھیں"، "وقت کی پگھلتی ہوئی رات، عقل و تہذیب کے صناع، ستاروں کا تنفس، بہاروں کا دفینہ، اندھیروں کی الم پوش ردا، آئین کی زنجیریں، احاطوں کے غلاف، سنگ غنودہ کا عذاب، اندھیروں کی عبا، موت کی انگلیاں، لمحہ کی الپسرائی، چاند کا سینہ، افکار کا چہرہ، احساس کی جھالر، بے نماز نظریں، جھنکارا جالے، اس طرح سے فکر اپنی انوکھی اور نئی تراکیب سے اپنی شاعری کی ایک خاص فضا پیدا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ فکر خواہ کسی موضوع پر بھی طبع آزمائی کریں، ایک

طرف تو ان کے اسلوب کی ندرت باقی و قائم رہتی ہے دوسری طرف موضوع ان کے اس انداز بیان کی وجہ سے چمک اٹھتا ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر فکر طلب ہے کہ فکر نہ صرف ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہے بلکہ وہ خود بھی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر رہے ہیں اور ہر ممکن طریقہ سے پارٹی کے کام کو اور نام کو آگے بڑھانے میں حصہ لیا ہے۔ فکر بھی اور ترقی پسند شاعروں کی طرح ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ ادب کو سماج کی بھلائی اور خدمت کے لیے وقف کرنا چاہتے ہیں۔ زندگی کے مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ زندگی کی اصلاح چاہتے ہیں۔ ملک و قوم کی خدمت کو عبادت سمجھتے ہیں۔ انسان اور انسانیت سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ محنت کش طبقے سے محبت کرتے ہیں اور ہر طرح سے اس کی بہتری کے خواہاں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود فکر کی شاعری کی سب سے بڑی اور امتیازی خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ کہیں بھی مقصدیت کا شکار نہیں ہوئے ہیں۔ استاد محترم ڈاکٹر یوسف سرمست نے فکر کی شاعری کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے راقم الحروف کو بتایا کہ فکر کی شاعری میں کہیں بھی نعرہ بازی نہیں ملتی اور ان کی کوئی بھی نظم راست انداز بیان کا سپاٹ پن نہیں رکھتی۔ وہ ہر بات کو ہر جذبہ کو ہر کیفیت کو علامتوں اور استعاروں کے نت نئے لباسوں میں پیش کرتے ہیں ۔"

فکر کا یہ اسلوب اور ان کے انداز بیان کی یہ خصوصیات اس موقع پر بھی خاص طور پر نمایاں ہوتی ہیں جبکہ وہ موجودہ تہذیب کا جائزہ لیتے ہیں۔ فکر اگرچہ کہ مارکسزم سے بے حد متاثر ہیں اور ظاہر ہے کہ ہر مارکسسٹ ادیب اور شاعر کی طرح وہ بھی زندگی کی جدلیاتی مادیت پر ایقان رکھتے ہیں۔ لیکن

اس کے باوجود وہ مغربی دنیا میں مادہ پرستی کا جو رجحان شدت اختیار کیے ہوئے ہے اس کی مخالفت میں اپنی شعری صلاحیتیں کام میں لاتے ہیں مادہ پرستی کی وہ روجو جدید تمدن کا امتیازی وصف بنی ہوئی ہے وہ ہمیشہ فکر کے طنز کا حدف بنتی ہے۔ مادہ پرستی کی دھن میں انسان جس طرح فطرت سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کو فکر نے اپنی کئی نظموں میں پیش کیا ہے جیسے ان کی طویل نظم "نیا انسان" اس بات کی روشن مثال ہے۔ اس نظم کا ایک بند ملاحظہ کے لیے پیش ہے۔

اسے دیکھ کر تم کہو گے
یہ آدم کے بیٹے نے کیا رنگ پایا
خدا کی زمین نے یہ کس اجنبی گت پر پربت اٹھایا
خدا کی زمیں اگلتی سڑتی زمین خوں بہاتی گراتی زمین اپنے آبا کی زرین امانت
بھلا کیسے چھوڑے گی اس اجنبی گت پہ اپنا ترانہ
یہ آدم کا بیٹا تو فطرت کا ہر نقش ہی کھو چکا ہے"
(ماہنامہ ادب لطیف لاہور۔ مدیر چودھری برکت علی جون ۴۹ء صہ ۳۱)

ان کی کئی دوسری نظموں میں بھی یہی خیال ملتا ہے۔ فکر کی شاعری کی اس خصوصیت پر کنیالال کپور رقم طراز ہیں۔

فکر کی فنی عظمت اس وقت مقام عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ جب وہ موجودہ مادی تہذیب کو اس پہلو پر تازیانے لگاتا ہے۔ جس پر دور حاضر کی گردن فرط غرور سے تن جاتی ہے۔ فکر موجودہ تمدن کی پری کا جنون آمیز اور

خونی رقص دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہے اور پھر نہایت یاسیت کے عالم میں یہ چاہتا ہے کہ موجودہ تہذیب اس ماضی کی طرف لوٹ جائے جبکہ اس میں تہذیب کی منزل تک نہ پہنچنے کے باوجود تہذیبی عناصر پائے جاتے ہیں"۔

(ہیولے مقدمہ کنہیالال کپور صلا)

موجودہ زندگی میں مادہ پرستی سے فکر اس لیے بیزار ہیں کہ جب انسان کے پیش نظر صرف مادی زندگی کی بہتری رہتی ہے تو اس کی خود غرض ذاتی منفعت غیرانسانی رویہ اپنے فائدے کے لیے دوسرے کو قربان کر دینے کا جذبہ انتہائی شدید صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مادی زندگی اور مادہ پرستی سے بیزارگی ہی شاید فکر کی شاعری کا محرک بنی ہے اور فکر یہاں انگلستان کے رومانی تحریک کے شاعروں سے متاثر اور ان کے ہمرکاب معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی سب سے پہلی نظم اس بات کا بہترین ثبوت ہے۔ ورڈس ورتھ نے اپنی نظم " دی ورلڈ از ٹو مچ وتھ از "میں جن خیالات کو پیش کیا تھا۔ اور فطرت پرستی کا جو نعرہ اس نے بلند بلند کیا تھا اس کی گونج فکر کی پہلی نظم " تنہائی " میں بھی صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔

دور جہاں کے ہنگاموں سے
سونی سونی ہے اک وادی
بنجر راہیں سنساں ٹیلے
کالی گہری لمبی درزیں
آگے پیچھے دائیں بائیں
مایوسی کی لہریں گائیں
غم کے جھولے میں لہرائے

ایک مسلسل سائیں سائیں
چر چر چر مر کرتے جائیں
رومانی تخیل کے ڈھانچے
لاکھوں ہلکی ہلکی نیندیں
ایسے آئیں ایسے جائیں
بادل کے پردوں کے پیچھے
چاند کی آنکھ مچولی جیسے
آہوں کی یہ طوفاں خیزی
ہانپ گیا تنہا فریادی
دور جہاں کے ہنگاموں سے
سونی سونی ہے اک وادی

فکر کی اس نظم میں ان کی انفرادیت بھی پوری طرح نمایاں ہے۔ فکر کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ میں بڑی وسیع معنویت پیدا کرتے ہیں۔ جس طرح ایک اچھا مصور چند لکیروں کے ذریعہ ذہن و خیال کے لیے ایک وسیع دنیا تخلیق کر دیتا ہے۔ اس طرح فکر بھی اپنی شاعری میں وسیع معنویت کفایت کے الفاظ کے ذریعہ پیدا کرتے ہیں۔ فکر کی شاعری کی ایک اور خصوصیت ان کے لہجہ کا کھردرا پن ہے وہ ملائم نازک یا نرم یا لطیف قسم کے الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ یہ شاید ان کی پوری زندگی کے مد و جزر کی وجہ سے ہے۔ یا ہو سکتا ہے کہ ان کے ماضی کا کھردرا پن نرم و نازک الفاظ کے انتخاب میں حارج ہوتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے

ماضی کا کھردراپن نرم و نازک الفاظ کے انتخاب میں حارج ہوتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے لہجہ کا پنجابی پن اس میں در آیا ہو۔ لیکن سب سے اہم اور بڑی بات یہ ہے کہ ان کے لہجہ کا کھردراپن بلکہ کرختگی بھی ان کی شاعری کے حسن کو متاثر نہیں کرتی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ موضوع کے مطابق فکر تراکیب، استعارے علامتوں اور لفظیات کا استعمال کرتے ہیں۔ اپنے موضوع اور خیال کو پوری شدت کے ساتھ نمایاں کرنے کی یہی کوشش اور خواہش کا نتیجہ تھا کہ فکر نے آزاد شاعری اختیار کی۔ کیونکہ وہ آزاد شاعری ہی میں اپنی فکر اور خیال کی جولانیوں کو نمایاں کر سکتے تھے۔ فکر کی توجہ تمامتر اس بات پر مرکوز ہوتی ہے کہ ان کے ذہن و خیال میں جو بات ہو وہ مکمل طور پر دوسرے تک اپنی اصلی اور فطری حالت میں پہنچ جائے۔ راقم کے نام ایک خط میں فکر اس بارے میں یوں تحریر کرتے ہیں کہ :

میرے نیچرل محسوسات میں کسی بھی قسم کی پابندی ان نیچرل
لگتی تھی۔ اس لیے میں آزاد نظمیں لکھنے لگا۔"

(خط بہ نام راقم از فکر تونسوی)

اپنی بات کو اپنے خیال کو اس طرح اصلی اور فکری شکل میں قاری تک پہنچانے کا یہی جذبہ فکر کو غزل سے آزاد نظم کی طرف لاتا ہے۔ اور پھر یہی جذبہ کی شدت انھیں آزاد نظم سے نثر کی طرف لے آتی ہے۔ یہ کچھ اور وسعت اپنے بیان کے لیے چاہنے کی خواہش نظم نگاری ترک کرنے کی طرف فکر کو مائل کرتی ہے۔ اور اپنے خیال کو اپنی فکر کو بے روک بے جھجک مسلسل رواں دواں پیش کرنے کی یہی خواہش ان کی نثر میں طنز نگاری کا محرک بنی ہے۔ وہ اپنی بات

کو اصلی حالت میں، فطری حالت میں تفصیل کے ساتھ بڑی شرح و بسط سے مکمل صورت میں قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

کچھ اور وسعت چاہیے میرے بیان کے لیے والی خواہش فکر کے لیے نئے میدان تلاش کرتی رہی ہے۔ بعد میں زندگی کے اور ملک کے بعض حادثات اور واقعات بھی ایسے رہے ہیں جو فکر کی اس خواہش کو شدید سے شدید تر کرتے گئے۔ فکر نے خود اپنے ایک خط میں راقم الحروف کو لکھا ہے کہ انھوں نے کیوں، کس لیے اور کن حالات میں شاعری ترک کی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"تقسیم ہند کے زبردست صدمہ پر میں نے محسوس کیا کہ میں جو باتیں عوام تک پہنچانا چاہتا ہوں، شاعری کا دامن ان کے لیے تنگ ہے بلکہ میرے محسوسات کا اظہار کرنا اس شاعری کے بس کا روگ نہیں۔ جیسی شاعری میں کرتا ہوں میری شاعری صرف ذات کے غم، ذات کی گہرائیوں اور پیچیدگیوں میں الجھی ہوی شاعری ہے۔ اس میں سماج غائب ہے۔ جس کا درد و غم ظاہر کرنا میرا تخلیقی آدرش بن گیا ہے۔"

(خط بہ نام راقم از فکر تونسوی)

یہاں یہ بات شاید واضح کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ گو فکر نے اپنی شاعری کو غمِ ذات تک محدود بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی پوری شاعری کا بیشتر حصہ اس بات کی نفی کرتا ہے ان کی شاعری مجموعی طور پر اپنے اطراف واکناف کی زندگی کو پیش کرتی ہے۔ اس کے دکھ درد کو نمایاں کرتی ہے۔ یہ سارے ہندوستان کی زبوں حالی کو بھی نمایاں کرنے میں کامیاب ہے۔ یہ

مجموعی طور پر انسان اور انسانیت کے غم کو اور ان کے مسائل کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ فکر کی شاعری کا غم ذات تک محدود ہونا صحیح ہو یا غلط بہر حال فکر نے شاعری ترک کردی۔ اور فکر کا شاعری کو ترک کرنا یقیناً اردو شاعری کے حق میں شاید کچھ زیادہ اچھا نہیں رہا ہے۔ فکر کی شاعری کی اٹھان اور اپنی شعر گوئی کے مختصر وقفہ میں فکر نے جو کچھ کہا ہے اس میں ایسی ندرت اور حدت فکر ملتی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مٹی ذرا نم ہوتی تو بڑی ہی زرخیز ہوتی۔ آج فکر کا شعری سرمایہ ایک مختصر سے مجموعے تک محدود ہے اور بہ حیثیت شاعر کے فکر کو بہت سے لوگ بھول گئے ہیں بھولتے جا رہے ہیں۔ پھر بھی فکر نے اس مجموعے کی حد تک بھی جتنا اور جیسا شعری سرمایہ چھوڑا ہے وہ بڑا وقیع ہے اور فکر کی شاعرانہ فکر کا ایک اچھا اور محکم ثبوت ہے۔

فکر نے شاعری ترک کر کے نثر نگاری کی طرف توجہ کی اور طنز و مزاح کے میدان میں اپنی رعنائی فکر کے جوہر دکھائے۔ اس طرح سے فکر کی شعر گوئی ترک کرنے کی تلافی بڑی حد تک ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی افسوس رہ جاتا ہے کہ فکر اپنی صلاحیتوں سے نظم اور نثر دونوں میدانوں میں اپنا مقام بنا سکتے تھے۔ مگر کیا کیا جائے کہ انھوں نے صرف ایک ہی میدان کو اپنے مکمل تصرف میں رکھنا گوارا کیا۔ فکر کی شاعری سے نثر کی طنز نگاری کی طرف مائل ہونا، اردو نثری طنز و مزاح کے لیے ایک بڑا اہم اور خوش گوار واقعہ ثابت ہوا ہے۔ شاعری کی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ فکر نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے ایسا نام و کام پیدا کیا ہے جو ہمیشہ یادگار رہے گا۔ فکر خواہ شعر کی دنیا میں رہیں یا نثر کے میدان میں۔ وہ جہاں بھی رہے فکر ہی رہے اور انسانی زندگی

کے لیے اور انسان کو انسان بنانے کے لیے فکر کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ فکر کا ہونا خواہ کہیں بھی ہو اور کسی صورت میں بھی ہو ایک بڑی اہم اور وقیع علامت ہے۔ یہ بات بہر حال غنیمت ہے کہ فکر نے اردو ادب کو نہیں چھوڑا اور اُردو ادب کی فکر بنے رہے۔ فکر کی شاعری اور تخلص کے بارے میں خود فکر کی یہ تحریر ملاحظہ فرمائیے۔

"فکر تونسوی شاعری ہی کی دین ہے۔ شاعری چھوڑ دی
تخلص نہیں چھوڑا۔"

(خط بہ نام راقم از فکر تونسوی)

ڈرامہ نگاری

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ فکر ایک بہت اچھے بلکہ بڑے کامیاب ڈرامہ نویس بھی ہیں۔ اب تک ان کے کئی ڈرامے اسٹیج کیے جا چکے ہیں اور انھیں بڑی کامیابی بھی حاصل ہوی ہے۔ فکر کی ڈرامہ نگاری کا آغاز ان کی شاعری سے ہی پہلے ہوا تھا۔ فکر نے اپنا سب سے پہلا ڈرامہ اس وقت لکھا تھا جبکہ ان کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔ اس ڈرامہ کی ایک اہم اور قابل ذکر بات یہ تھی کہ فکر نے خود اس میں کام کیا تھا۔ اس ڈرامہ کا نام "سیتا دان اور ساوتری" تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ فکر صرف ہائی اسکول کے بھی ابتدائی درجہ میں تھے۔ اس ڈرامہ کا موضوع جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ مذہبی تھا۔ اس ڈرامہ میں فکر نے ساوتری کا رول ادا کیا تھا۔ یہ رول فکر نے ایسی خوبی سے نبھایا تھا کہ دیکھنے والوں میں سے کسی کو بھی یہ گمان نہیں تھا کہ اس رول کو ایک لڑکا انجام دے رہا

ہے۔ فکر کی اداکاری کے ساتھ اس ڈرامہ میں رام نارائن کی کامیابی کی وجہ وہ میک اپ بھی ہو سکتا ہے۔ جو اس وقت کیا گیا تھا۔ کیونکہ فکر کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا ناممکن ہے کہ وہ ایک نرم و نازک عورت کے رول میں اس خوبی سے کھپ گئے یا یہ بھی ہو سکتا ہے فکر اپنی عمر کے ابتدائی زمانے میں خوب رو تو کیا ایسے ضرور رہے ہوں گے کہ لڑکی کا پارٹ آسانی اور کامیابی کے ساتھ کر سکیں۔ فکر کے اس ڈرامہ اور ان کی اداکاری کے پیش نظر اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ فکر ابتدا میں مذہبی رہے ہوں گے۔ خاندانی ماحول اور خاندانی روایات کا اثر بھی ظاہر ہے کہ اس وقت فکر پر پوری طرح کام کر رہا تھا ۔ فکر کی فکر ابھی آزاد نہیں تھی اور وہ ماحول اور خاندانی روایات سے کافی متاثر تھے۔ فکر نے اس ڈرامہ کے تعلق سے راقم الحروف کو ایک خط میں تحریر کیا کہ

"وہ ڈرامہ جس میں میں نے خود عورت کا پارٹ ادا کیا تھا وہ ایک مذہبی جمع تاریخی واقعہ پر مشتمل تھا جسے میں نے اپنے الفاظ میں قلم بند کیا تھا، اس کا نام "ستھیا وانی اور ساوتری" ساوتری کا رول میرا تھا، اس وقت میری عمر تیرہ برس کی تھی۔"

(خط بہ نام راقم از فکر تونسوی)

کم عمری کے اس زمانے سے گو فکر نے ڈرامہ نگاری شروع کر دی تھی۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک مدت تک انھوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی اور رام نارائن ڈرامہ نگار ہی ابتدا میں ہم سے ملتا ہے۔ بعد

یں جب رام نارائن فکر تونسوی بن کر سامنے آئے تو وہ ایک شاعر اور مدیر تھے۔ اس طرح سے ایک لمبی مدت تک فکر نے کوئی ڈرامہ نہیں لکھا یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے کوئی ڈرامہ لکھا ہو یا کئی ڈرامے لکھے ہوں اور وہ محفوظ نہ رہے ہوں۔ بہر کیف دہلی کے قیام کے زمانہ میں پھر ایک بار رام نارائن ڈرامہ نگار فکر تونسوی کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس دوران میں جو خاص طویل مدت ہے فکر تونسوی نے صرف چار ہی ڈرامے لکھے ہیں۔ یہاں اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے بلکہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس سے بھی زیادہ ڈرامے فکر نے لکھے ہوں گے۔ لیکن وہ ان کے پاس محفوظ نہیں رہے یا یہ کہ وہ اسٹیج نہیں ہوئے اس لیے فکر نے ان کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ فکر کے پاس جیسے ان کا خاندانی ریکارڈ صرف دو پشت تک ہی کا محفوظ ہے۔ اور اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ خود ان کے پاس ان کی تصنیف کردہ کتابیں پوری کی پوری نہیں ہیں اور فکر کا پہلا اور آخری مجموعہ کلام "ہیولے" بھی ان کے پاس موجود نہیں ہے۔ اس سے فکر کی طبیعت کا بے فکری رجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔ فکر کی یہی بے فکری نے ان کو کسی بھی قسم کے اپنے ادبی ذخیرہ کو جمع کرنے سے مانع رہی۔

دہلی کے قیام کے زمانے میں فکر نے جو ڈرامے لکھے ان میں سے ایک ڈرامہ "نیا موری" ہے۔ یہ ڈرامہ بھی ان کی طنز نگاری کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے یہ ڈرامہ شادی بیاہ اور عشق کے پرانے فرسودہ رسوم پر مبنی ہے اس میں بھی فکر نے سماجی زندگی کی بندشوں کو اپنے طنز و مزاح کا ہدف بنایا ہے۔ بیسویں صدی بھی جو صرف جوہری توانائی کا ہی دور نہیں

بلکہ خلائی دور بھی ہے اور انسان چاند اور ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ ہندوستانی جس طرح کئی صدیوں پرانے رسوم میں جکڑے ہوئے ہیں لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں یہی بات فکر کے طنز کو مہمیز لگاتی ہے اور وہ ہندوستانیوں کے ان پرانے معتقدات پر طرح طرح سے اور نئے نئے پہلوؤں سے وار کرتے ہیں۔ فکر نے اپنے مخصوص طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں عشق کے سلسلے میں بھی ہم ہندوستانی جس طرح رسوم کی بندشوں میں جکڑے ہوئے ہیں ان کا بھی مضحکہ اڑایا ہے پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستانیوں کی اس فرسودہ مزاجی اور کوتاہ نظری کے تعلق سے یہ بات کہی تھی کہ "ہم اب بھی گوبر کے زمانے میں ہیں"۔ ان کے الفاظ تھے "وی آر اسٹل ان کاؤ ڈنگ ایج"

فکر کے ڈرامے کا موضوع بھی اصل میں یہی ہے فکر اپنے اس ڈرامہ کے ذریعہ زمانہ جس طرح بدل چکا ہے۔ زمانے نے جس طرح ترقی کرلی ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ہندوستانی زمانے کی اس ترقی سے منہ موڑے ہوئے اپنی ہی قدامت پرستی میں ملفوف ہیں۔ انھوں نے اپنے اس ڈرامہ میں اس بات کو بھی بڑی خوبی سے پیش کیا ہے کہ اب کس طرح سے پرانی بندشوں سے نجات پائی جاسکتی ہے اور ان سے نجات پانے میں ہی ہماری نجات ہے۔ ان کا یہ ڈرامہ "اندر پرستھ تھیٹر" نے دہلی میں پیش کیا۔ اس تین ایکٹ کے ڈرامہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوی اب تک یہ کئی بار اسٹیج کیا جاچکا ہے۔

اندر پرستھ کے زیر اہتمام فکر کا جو دوسرا ڈرامہ پیش کیا گیا وہ ہے

"دربار اکبری" یہ ڈرامہ بھی کافی طویل ہے اور اس کا موضوع ہے" سیکولرزم کی اہمیت اور اس کی ضرورت۔ اس ڈرامہ میں فکر نے دربار اکبری کو پیش کرتے ہوئے یہ بتایا کہ اکبر کو اکبر اعظم بنانے والی چیز اس کا سیکولر نقطہ نظر تھا۔ اور یہ سیکولر نقطۂ نظر اس کے دربار میں پوری طرح نمایاں ہوتا تھا۔ یہاں فکر نے اپنے خاص انداز سے طنز و مزاح کو کام میں لاتے ہوئے یہ بات بڑی خوب صورتی سے پیش کی ہے کہ ہندوستان میں کوئی بھی حکومت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ سیکولر کردار کی حامل نہ ہو دربار اکبری کے نورتن بھی سامنے آجاتے ہیں۔ اور ان نورتنوں میں بیربل اور مُلّا دوپیازہ ایک خاص امتیازی اور انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ دونوں ہندو مسلم کردار دربار اکبری کے سیکولر تصور کو پیش کرتے ہیں۔ ان دونوں کی دوستی، محبت اور چشمکیں اصل میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اور یہ بھی دربار اکبری میں سیکولر کردار کو روشن اور تابناک بناتی ہیں۔ فکر نے اپنے اس ڈرامہ میں بہترین طور پر یہ بات بھی پیش کی ہے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان جب تک دربار اکبری کا ماحول پیش نہ کریں، دربار اکبری کی فضا کو نہ اپنائیں اس وقت تک ان کی زندگی میں سکون پیدا نہیں ہو سکتا نہ ہی وہ اطمینان سے زندگی گزار سکتے ہیں۔

فکر کا تیسرا ڈرامہ "ہل چل" ہے۔ ہل چل بھی اندر پرستھ تھیٹر کے زیر اہتمام دہلی میں کئی بار پیش کیا جا چکا ہے اور اس کا کئی بار پیش کیا جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ڈرامہ کتنا کامیاب رہا اور اس کو کتنی مقبولیت حاصل رہی۔ اس ڈرامہ کا موضوع دولت کی ہوس اور دولت کے ذریعہ جو

جھوٹی شان و شوکت پیدا کی جاتی ہے اور بہت سے افراد کی آنکھیں ان چھوٹے نگینوں کی ریزہ کاری سے خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اس کو فکر نے اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ فکر اپنے اس ڈرامہ کے ذریعہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ موجودہ تہذیب نے کس طرح سے تمام قدریں دولت کے سامنے پس پشت چلی گئی ہیں۔ اب دولت کی ہوس اور دولت ہی کو شان و شوکت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب سادا رہنا اور سادگی سے زندگی گزارنا اونچے مقاصد اور اونچے آدرش رکھنا زندگی کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج اس کے بالکل برعکس شان و شوکت سے رہنا اور انتہائی پست ذہنیت اور انتہائی مکروہ ذہنیت رکھنا برا نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ یہی سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے۔ دولت نے موجودہ زندگی میں اور موجودہ تمدن میں جو اہمیت حاصل کر لی ہے وہ پورے معاشرے کو جس پستی میں ڈھکیل رہی ہے اس کی طرف فکر نے اپنے ڈرامہ میں موثر طور پر اشارے کیے ہیں آج دولت کا حصول بھی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم مقصد سمجھ لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی زندگی میں جیسی گراوٹ اور ملاوٹ ملتی ہے۔ اس کی مثال شاید انسانیت کی تاریخ میں کہیں بھی نہیں ملتی۔ دولت کی شان و شوکت نے انسان کو جس طرح حیوان بنا دیا ہے اس پر بھی فکر نے ہل چل میں بھرپور طنز کیا ہے اور پھر یہ دولت پر مر مٹنے والے جس طرح مضحکہ خیز بن جاتے ہیں اس کو بھی فکر نے بڑی خوبی اور عمدگی سے اجاگر کیا ہے۔

فکر کا چوتھا ڈرامہ "میری شادی" بھی اس تھیٹریکل کمپنی یعنی انڈر اپر سوتھ تھیٹر سے پیش کیا گیا۔ اس ڈرامہ کو بھی بڑی مقبولیت حاصل

ہوئی اور یہ بھی دوسرے ڈراموں کی طرح کئی بار دہلی میں پیش کیا گیا۔ اس ڈرامہ کا موضوع مہاتما گاندھی جی کے وہ موقع پرست مقلد ہیں جو اپنی ذاتی منفعت کے لیے اپنے آپ کو گاندھی جی کا پرستار اور ان کا سب سے سچا اور اچھا چیلا ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں فکر تونسوی نے گاندھی جی کی بے لوث زندگی ان کی قربانی اور ایثار کے جذبہ کو بھی پیش کیا ہے۔ اور پھر یہ بھی دکھایا ہے کہ گاندھی جی نے ہندوستان کی ہندوستانیوں کی انسان کی اور انسانیت کی بڑی بے غرض اور بے لوث خدمت کی ہے۔ حد یہ ہے کہ اس لیے انھوں نے اپنی پوری زندگی وقف کردی تھی۔ ساری زندگی قوم کے لیے ایثار و قربانی کس طرح کی جاتی ہے اس کا نمونہ پیش کرنے کے لیے صرف ایک چھوٹی سی دھوتی ہی پر اکتفا کی۔ اور زندگی بھر چپل کے سوا کوئی اور پاپوش پہننا گوارا نہ کیا۔ ایک طرف تو گاندھی جی کا یہ قربانی کا جذبہ ہے دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو ان کے نام کو اور کام کو آڑ بنا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ جو اپنی ذات کے لئے اپنے لیئے انسان کو انسانیت کو ملک کو قوم کو سب کو دار پر چڑھا دیتے ہیں۔ فکر کا یہ ڈرامہ میری شاید تین گھنٹوں کا ایک طرح سے میوزیکل اوپیرا ہے۔ فکر نے بہت دل چسپ انداز سے گاندھی جی کے موقع پرست چیلوں پر گہرا طنز کیا ہے۔

فکر نے اسٹیج کے لیے یہ چار ڈرامے بڑے ہی کامیاب لکھے ہیں۔ یہ ڈرامے اسٹیج کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ فکر نے اسٹیج کی ضرورتوں کو کس حد تک مدنظر رکھا ہے اور ان کو اس میں کتنی کامیابی اور ان کو اس میں کتنے بڑے پیمانہ پر شہرت حاصل ہوئی اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ ڈرامے اب تک

کئی کئی بار اسٹیج کیے جا چکے ہیں اور عوام و خواص سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ڈراموں میں فکر کا طنز کچھ زیادہ ہی ابھر آتا ہے بلکہ یہہ کہنا چاہیے کہ وہ زیادہ متاثر کن بن جاتا ہے۔ فکر کے یہ تمام ڈرامے مقصدی ہیں لیکن فکر کی خوبی ہمیشہ یہ رہتی ہے۔ وہ شاعری ہو یا ڈرامہ نگاری اپنے مقصد کو بڑی خوبی سے پیش کر جاتے ہیں۔ اور مقصدیت کا شکار کبھی نہیں ہوتے۔ فکر کے ان ڈراموں کو دیکھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فکر کردار نگاری پر کتنا عبور رکھتے ہیں۔ اور اپنے کرداروں کے ذریعہ اپنے مقاصد اور اپنے طنز کو کس درجہ بھرپور بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ کردار بغیر مکالموں کے بے جان بن کر رہ جاتے ہیں اور مکالموں کے ہی ذریعہ کردار بھی مکمل طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ مکالموں میں کردار کی شخصیت، مقام و ماحول وقت اور زمانہ کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ فکر اپنے مکالموں میں ان تمام باتوں کا فنی لحاظ سے خیال رکھتے ہیں اور کردار کے مطابق ایسے برجستہ اور برمحل مکالمے لکھتے ہیں کہ ایک طرف تو کردار اپنی پوری تکمیل کے ساتھ نمایاں ہو جاتا ہے تو دوسری طرف کردار کا ماحول اس کی سماجی حیثیت اس کی ذہنی حالت اور اس کی نفسیاتی کیفیات بھی پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح سے ان کا طنز زیادہ گہرا اور زیادہ پر اثر بن جاتا ہے۔ یہی چیز فکر کے ڈراموں کی امتیازی خصوصیت ہے اور اسی وجہ سے فکر کے ڈرامے بڑے پسند کیے جاتے ہیں اور انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔

اسٹیج کے لیے فکر نے یہ جو مذکورہ بالا ڈرامے لکھے ہیں ان کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے بھی وہ بے شمار ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ ان کے ریڈیو

کے ڈراموں میں بھی ان کا طنز مکمل اور واضح ہے۔ ان کے ریڈیائی ڈرامے بھی بڑے کامیاب رہتے ہیں اور اس کے ذریعے بھی فکر طنز اور مزاح کے نشتر چبھو کر سماج کی بیماریوں کا علاج کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فکر بنیادی طور پر طنز نگار ہیں اور اسی "دریائے پُر امواج" کی ایک موج ڈرامہ نگاری ہے۔

○○

ناول نگاری

فکر کا طنز روپ بدل بدل کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان کی ناول نگاری بھی اسی کا ایک بہروپ ہے۔ فکر نے کئی طنزیہ ناول لکھے ہیں جیسے "پروفیسر بدھو" "چوپٹ راجہ" "ماڈرن علاالدین" اور "چاند اور گدھا" ان کا ایک اور ناول "پنجاب کو سلام" کے نام سے لکھ رہے تھے۔ جو کبھی شائع ہو کر منظر عام پر نہیں آیا۔ فکر کے ناول شروع سے آخر تک زندگی کے مختلف پہلوؤں پر طنز کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں ان کے ناول بہ حیثیت ناول کے کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول نگار کی حیثیت سے فکر کا نام تک نہیں لیا جاتا۔ ان کے ناولوں میں پلاٹ کے اعتبار سے مکالموں یا کسی اور لحاظ سے کوئی ایسی قدرت نہیں رکھتے جس کی وجہ سے اُردو ناول نگاری میں ممتاز ہو سکیں۔ اصل میں فکر کے ناول شروع سے آخر تک طنز سے بھرپور ہوتے ہیں۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر طنز کرنے کے لیے فکر ایک کہانی کا سہارا لے لیتے ہیں۔ اور کسی کردار کی زندگی

کے مختلف واقعات کو اپنے طنزیں پروکر ناول کی ایک شکل دیتے ہیں۔ جس طرح سے ان کے کالموں میں بعض وقت کسی واقعہ کو وہ بیان کرتے ہیں یا کسی انشائیہ یا مضمون میں بعض واقعات کا ذکر کرتے ہوئے ان پر طنز کرتے ہیں یا جس طرح وہ بعض مضحکہ خیز واقعات کو پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ناول میں بھی وہ مختلف واقعات کے ذریعہ اپنے طنز کو ایک وسیع تر شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اصل میں وہ اپنے طنز کے پھیلاؤ کو ناول کا نام دیتے ہیں۔ رہے کردار وہ تو ہر طنز نگار زندگی کے مضحکہ خیز کرداروں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ فکر کے پاس بھی ان کے کالموں میں اور دوسری مختلف کتابوں میں کوئی نہ کوئی کردار یا کسی کردار کی کوئی جھلک ضرور ملتی ہے۔ ایسے ہی کرداروں کو وہ اپنے ناولوں میں اکٹھا کر دیتے ہیں اور ان کو ایک پلاٹ میں پرونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح مکالمہ نگاری بھی ان کے مختلف تحریروں میں ملتی ہے۔ رہا پس منظر اور ماحول تو یہ کسی بھی طنز نگار کے لیے سب سے اہم اور مقدم حیثیت رکھتا ہے۔ اصل میں اس پس منظر کی خامیوں اور کمزوریوں کو ابھارنے کے لیے کردار پیش کیے جاتے ہیں "یا" کردار کو پیش کرنے کے لیے پس منظر پیش کیا جاتا ہے۔ طنزیہ ناول نگار کے پاس منظر پس منظر ہوا کرتا ہے۔ اور پس منظر منظر ہوا کرتا ہے۔ یہی بات فکر کے ناولوں میں بھی صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔

فکر نے یوں تو کئی ناول لکھے ہیں جن کے نام اوپر گنائے جا چکے ہیں۔ لیکن ان کے ناولوں میں پروفیسر بدھو ہر لحاظ سے انکا ایک نمائندہ ناول کہا جا سکتا ہے۔ اس ناول میں فکر کا طنز کافی بھرپور اور نمایاں شکل میں

ابھرتا ہے۔ اس ناول کا موضوع اصل میں ایک دانشور کی نصب العینی محبت ہے
پروفیسر بدھو اپنی اسی تخیلی محبت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے
اور اس کی اسی تلاش میں اس کا کردار بھی نمایاں ہوتا ہے اور زندگی کے مضحکہ خیز پہلو بھی اس کی جستجو کی وجہ سے نمایاں ہوتے ہیں۔ فکر نے اس ناول میں خود آدرش عشق کے تصور کا بھی ایک طرح سے مذاق اڑایا ہے اور یہ بات ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ زمانے میں آدرش عشق پیش کرنا بڑا مشکل ہے۔ ناول کی ابتداء اصل میں ناول نگار اور اس کے ایک دوست کے مباحثے سے شروع ہوتی ہے۔ دوست جو ناول نگار نہیں ہے اپنے ناول نگار دوست سے عاشقانہ ناول لکھنے کی فرائش کرتا ہے۔ ناول نگار دوست کہتا ہے کہ:

"عشق کا ناول لکھنا ناممکن ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہیرو نہیں ملتا"

(پروفیسر بدھو۔ از فکر تونسوی مطبوعہ ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۰)

اور پھر اپنے دوست کو چیلنج کرتا ہے کہ وہ اس موضوع پر ناول لکھ کر دکھا دے اور طنز یہ یہ بھی کہتا ہے "تاکہ آنے والی نسلیں آپ پر تو کم از کم ناراض نہ ہوں" اور یوں غیر ناول نگار دوست اس چیلنج کی وجہ سے ناول نگار بن جاتا ہے اور اسطرح سے ناول شروع ہوتا ہے۔ ناول میں سب سے پہلے ہیرو کی جستجو ہوتی ہے۔ کیونکہ ناول نگار دوست کا دعوی یہی تھا کہ عاشقانہ ناول اس زمانے میں لکھنا اس لیے مشکل ہے کہ کوئی عاشق نہیں ملتا۔ یہاں فکر نے عاشق کے نہ ملنے پر موجودہ حالات پر طنز کیا ہے جیسا کہ وہ ساتھی سے

یہ بات کہی تھی "دمشق میں اتنا قحط پڑا تھا کہ لوگ عشق کرنا بھول گئے تھے" اس اس طرح سے گویا ناول نگار یہ دعوی کرتا ہے کہ ایسے دور میں کوئی سچا عاشق کس طرح سے مل سکتا ہے۔ لیکن غیر ناول نگار دوست کو اپنے ناول کے لیے پروفیسر بدھو جیسا عاشق مل جاتا ہے۔ یہاں بھی دوہرا طنز کیا گیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ کوئی بدھو ہی اس زمانے میں ایسا ہو سکتا ہے کہ جو عشق جیسے فضول کام میں نکمہ پن کا ثبوت دے سکتا ہے اور دوسری بات یہ کہ اس بدھو کو بھی اپنے عشق کو قائم و باقی رکھنے کے لیے پروفیسر ہونا ضروری ہے گویا بغیر غائب دماغی کے عشق ہو سکتا ہے اور نہ عشق کی سرگرمی کو جاری رکھا جا سکتا ہے۔

ناول کا ہیرو پروفیسر بدھو اپنے ہیرو کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اس ہیرو کی تلاش میں وہ جن جن واقعات، جن جن لوگوں سے زندگی کے جیسے دردناک اور کرب ناک پہلوؤں سے گزرتا ہے۔ سماجی ناانصافی اور سماج کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو جس طرح دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ معاشرے کی ناہموار پہلوؤں کو جس طرح شدت سے محسوس کرتا ہے اور مختلف حالات میں انسانی فطرت کے نشیب و فراز سے جس طرح انسان گزرتا ہے ان سب کی تصویریں اس ناول میں ملتی ہیں۔

پروفیسر بدھو، امیروں کے پاس جو دوہرے معیار ملتے ہیں اور اپنے لیے جس طرح وہ دوسرے کی ہر چیز کو قربان کر دیتے ہیں اس پر گہرا طنز کیا ہے۔ ایک جگہ وہ ایسے ہی لوگوں کی حالت زار بتاتے ہوئے امیروں اور راجاؤں پر یوں طنز کیا ہے۔

"ان سلگڑیوں کے کھوکھوں میں وہ لوگ آباد رہے جنھیں انقلاب

کے وقت قریبی ریاست چوپٹ گڑھ کے راجہ نے دو بار سے بھگا دیا تھا۔ اور وہ اس شہر میں آکر پناہ گزین ہو گئے تھے چوپٹ گڑھ کے راجہ نے اس لیے بھگا دیا تھا کہ کیونکہ راجہ خود آدمی تھا۔ ان لوگوں نے راجہ پر یہ الزام لگایا تھا تھا کہ وہ راجیہ کی ہر نوجوان لڑکی کو (جو حسین ہو یا نہ ہو) زبردستی اٹھا کر اپنے محل میں لے جاتا ہے اور بہت سے راجہ کے نوجوان لڑکے محبت کرنے کے لیے اپنی محبوبائیں تلاش کرتے ہیں لیکن نہیں ملتیں ـــــ مگر راجہ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ راج نیتی کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ راجہ کا دل و دماغ ہر وقت شگفتہ رہے اور نئے نئے حسین چہروں کے تصورات سے معمور رہے تاکہ وہ راجیہ کا کام نہایت حسن و خوبی سے چلا سکے۔ رعایا کے نوجوانوں کی محبت کے مقابلے میں راجیہ کا کام چلانا ضروری ہے۔ (پروفیسر بدھو ص ۳۵)

بلیٹ نے طنز کی یہ تعریف کی تھی کہ انسان اور اس کے کردار کے معیوب اور احمقانہ پہلو پر کی جانے والی ادبی تنقید کو طنز کہا جاتا ہے۔ فکر کے پاس بھی طنز کی یہی خصوصیت ملتی ہے اور خاص طور پر ان کے ناولوں پر یہ بات حرف بہ حرف صادق آتی ہے۔ انکے ناول کا ہر کردار یا تو کوئی نہ کوئی احمقانہ پہلو رکھتا ہے یا اپنے کردار میں کوئی نہ کوئی عیب رکھتا ہے۔ فکر اپنے ناولوں میں انسان کی اس حماقت اور ان کے عیوب کی پردہ داری کرتے ہیں۔ فکر اپنے ناول میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر طنز کرتے ہیں۔ خاص طور سے

دولت اور دولت کی حرص لکھنے والوں پر ان کا طنز تیکھا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ فکر یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہی انسانی معاشرہ میں خرابی کی جڑ ہے اور اس وجہ سے انسان، انسانیت سے گر جاتا ہے اور جب دولت کا حصول "شعور بالذات" بن جاتا ہے تو پھر گندگی کی کوئی بھی اخلاقی قدر باقی رہتی ہے نہ ہی کسی مذہبی بندش کا خیال کیا جاتا ہے۔ دولت کی اس ہوس پر طنز کرتے ہوئے وہ اپنے ایک کردار مصرا کی حالت زار بتاتے ہیں۔ ناول کا ایک کردار مصرا پروفیسر بدھو کو اپنے حالات سناتا ہے اور سنانے کے بعد اس کی محبوبہ اس سے محبت کرنا بھول جاتی ہے اور جب پروفیسر بدھو پوچھتا ہے کہ وہ کیوں بھول گئی۔ کیا اس کا حافظہ کمزور تھا۔ اس کے جواب میں مصرا پروفیسر بدھو کو کہتا ہے۔

"ہاں شاید حافظہ ہی کمزور تھا۔ کیونکہ شادی کے بعد محبت کی بجائے اس نے یہ کہنا شروع کر دیا۔ پیارے کھانا وقت پر کھایا کرو، اور وقت پر کھانا جب ہی کھایا جاتا ہے۔ اگر تم باقاعدہ بزنس شروع کر دو۔ پروفیسر صاحب دراصل اس کی ماں ایک دولت مند بیوہ ہے اور وہ چاہتی ہے میں دس ہزار روپیہ لگا کر دریا سے مچھلیاں برآمد کرنے کا ٹھیکہ لے لوں چنانچہ ایک ہی سال بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے خوش دامن صاحبہ نے اپنی حسین بیٹی میرے ساتھ نہیں بیاہی بلکہ مچھلیوں کے کسی بڑے بھاری جال کے ساتھ بیاہی ہے اور

وہ ابلہ اپنے داماد کی ذہانت کو مارکٹ میں بیچنا چاہتی ہے۔ بالکل
ویسے ہی جیسے مچھلیاں بیچی جاتی ہیں اور ایسے ہی بیچی جاتی ہیں
جیسے ٹین کی چادریں بیچی جاتی ہیں۔"

(پروفیسر بدھو صد ۵۹)

اس طرح اس ناول میں قدم قدم پر طنز کے جال ملتے ہیں جس میں دولت کی حرص رکھنے والے پھنسے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ناول اس طرح سے شروع سے آخر تک زندگی کے مختلف مضحکہ خیز پہلوؤں کو سامنے رکھ کر پروفیسر بدھو اپنی آدرش عشق کے چکر میں مختلف مقامات مختلف لوگوں اور مختلف محبوباؤں سے دو چار ہوتا ہے اور پھر اپنے اس سفر کے دوران دولت مند بن جاتا ہے اور جب دولت مند بن جاتا ہے تو اس کے پاس ہر بات کی ہر چیز کی فراوانی ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ دولت کے بل بوتے پر تو ہر چیز حاصل کی جا سکتی ہے لیکن یہ چیزیں دولت ہی کی وجہ سے اپنی قدر و قیمت کھو دیتی ہیں۔ اس قول محال کو پروفیسر بدھو میں فکر تونسوی نے یوں نمایاں کیا ہے۔

"اور پروفیسر بدھو جیسے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا روپے
پیسے کی افراط نے اسے روپے پیسے ہی سے محروم کر دیا
کیونکہ وہ جس چیز کی طرف بھی اشارہ کرتا فوراً حاضر ہو
جاتی وہ چیز جو پیسے سے آسکتی ہے بغیر پیسے کے مل
جاتی، اس لیے پیسے کی ضرورت اس کی زندگی میں سے
نکل گئی تھی۔ پیسہ تو کسی نہ کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے

کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب چیز حاصل ہو جائے تو پیسہ حاصل کرنے کی خواہش مر جاتی ہے۔ عزت، شہرت، دولت اور محبت ان سب ہی چیزوں کی فراوانی پر پروفیسر بدھو کو کو ایک ایسی منزل پر پہنچا دیا جہاں انسان اپنے سوچنے کی طاقت کھو بیٹھتا ہے۔"

(پروفیسر بدھو صفحہ ۱۷۳)

اور پروفیسر بدھو کا یہ احساس شدید ہوتا جا رہا ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ پیسے کے زور پر جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں وہ اکثر مصنوعی کھوکھلی اور بیہودی ہوا کرتی ہے اور یہ کہ پیسہ انسان سے انسانیت چھین لیتا ہے۔ اس وجہ سے پروفیسر بدھو چلا اٹھتا ہے۔ میں جانور سے پھر انسان بننا چاہتا ہوں اور اسی انسان بننے کی خواہش اور کوشش میں وہ ایک بار پھر پیسے کے جال سے نکل جاتا ہے کیونکہ پیسے سے اسے جو بھی چیزیں حاصل ہوئی تھیں وہ بے حد کھوکھلی تھیں اور جو محبت اسے مس کولکی والا سے حاصل ہوئی تھی وہ بھی انتہائی کھوکھلی تھی۔ پروفیسر بدھو کے اندر کا انسان اس دھوکہ اور فریب کی زندگی سے ایک دم اکتا جاتا ہے اور اسی اکتاہٹ کے نتیجہ میں وہ نکل کھڑا ہوتا ہے اور پھر وہ مختلف جگہوں سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے غریبوں کی اس بستی کو پہنچتا ہے جہاں اس کو سچا خلوص اور پیار ملتا ہے۔ اور آخر میں وہ ایک مفلس اور پاگل لڑکی سے عشق بھی کرتا ہے اور اس سے شادی بھی رچا لیتا ہے۔ اس طرح فکر تونسوی کا طنزیہ ناول ہے پروفیسر بدھو مختلف زندگی کے پہلوؤں پر گہرا طنز کرتے ہوئے اختتام کو پہنچا ہے

روزنامچہ نگاری

فکر تونسوی نے اپنا ایک "روزنامچہ" "چھٹا دریا" کے نام سے لکھا ہے۔ یہ ڈائری ہندوستان کی خونچکاں داستان کا ایک ہولناک باب ہے۔ ہندوستان کی تقسیم ایک قطعہ زمین کی تقسیم نہیں تھی بلکہ یہ ایک جسم ایک روح ایک تہذیب کی تقسیم تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب ایک ایسے جسم کو تقسیم کیا گیا جس میں صدیوں کی ملی جلی تہذیب بول رہی تھی۔ اس جسم کی تقسیم سے خون کے فوارے پھوٹنے لگے۔ اس جسم کو بڑی بے دردی سے ریڈ کلف نے اپنے نوک قلم سے چیر دیا۔ اس میں ایک زندہ اور جاندار جسم کی تقسیم کی طرح خون بہا تھا۔ یہ خون انسانیت کا تھا اور انسانیت کو فکر نے اس خون کی ہولی کو آنکھوں سے دیکھا تھا اور یہ موج خون فکر کے سر سے بھی گزری تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ فکر جیسا حساس شاعر ادیب اور طنز نگار ان سب کو ایسی ہولناک بزم کا خاموش تماشائی بن جائے۔ وہ انسانیت کی اس توہین پر انسان کے اس قتل پر چیخ اٹھا۔ اس کی اس چیخ کی گونج ڈائری

میں صاف طور پر سنائی دیتی ہے، فکر پنجاب سے بڑا خلوص رکھتے ہیں یہ پانچ دریا جس طرح سے زندگی کو سیراب کرتے ہیں انسانیت کی خدمت کرتے ہیں ان پانچ دریاؤں کے قریب ہندو مسلم تہذیب کے پاکیزہ نمونے ملتے ہیں، ان دو مختلف المذہب قوموں کے نقطۂ اتصال سے جس شاندار تہذیب نے جنم لیا ہے اس سے فکر بے حد متاثر ہیں۔ لیکن اس نقطۂ اتصال کو جب نقطۂ اختلاف بنا دیا گیا تو ایک تہذیب کا خون ہوا۔ ایک تمدن ختم ہوا ایک جسم سے روح کو الگ کرنے کی کامیاب لیکن بے حد مظلوم کوشش کی گئی۔ اور اس نقطے سے وہ چھٹا دریا بھی پھوٹ پڑا جس میں انسانیت اور انسانی تہذیب خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ فکر یہ بتاتے ہیں کہ یہ چھٹا دریا آگ اور خون کا ایک دریا ہے، انسان اور انسانیت سوزی کا ایک لاوا ہے ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کا جوالا ہے۔ اور یہ ایک ایسا خونی دریا ہے جس میں ہر چیز ڈوب گئی۔ ہر چیز تباہ اور تاراج ہو گئی۔ فکر اس سانحہ کے چشم دید گواہ ہیں جو اس سانحہ سے تڑپ اٹھے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ان کے جسم و جان کا رشتہ ٹوٹ رہا ہے، وہ اس بہیمیت کے خلاف وہ بے دردانہ قتل کے خلاف اپنی آواز اٹھاتے ہیں اور اپنا قلم چلاتے ہیں۔ بعض نام نہاد انسانوں کی انسانیت سوز سیاہ کاریوں کی وجہ سے اس ڈائری کے کئی صفحات سیاہ ہوئے ہیں۔

اس تصویر کشی میں صرف تخریب کی مصوری نہیں کی گئی ہے بلکہ تعمیر کی جستجو اور تعمیر کے لیے تڑپ بھی اس میں پوری طرح نمایاں ہے سہیل عظیم آبادی فکر کی اس ڈائری یعنی چھٹے دریا کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

"فکر کی یہ کتاب محض ایسی کتاب نہیں ہے جو لکھنے کے لئے لکھی گئی

ہو بلکہ اس لیے لکھی گئی ہے بلکہ اس لیے لکھی گئی ہے۔ وہ
کچھ کہنا چاہتا ہے وہ حال کی بھیانک تصویر دکھا کر
مستقبل کو سنوارنے کی دعوت دے رہا ہے وہ سوچنے
کی دعوت دے رہا ہے پنجاب کے فرزندوں کو اپنی
بگڑی بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ فرقہ پرستی اور فرقہ
پرستوں نے یہ دن دکھائے ہیں جن کے چہروں پہ مذہب
پرستی کی سنہری نقابیں پڑی ہوی ہیں۔ ان نقابوں کو
ان کے چہرے سے نوچ کر پھینک دینے کی ضرورت
ہے تاکہ ان کے اصلی چہرے پہچانے جا سکیں۔"

(چھٹا دریا از فکر تونسوی۔ مقدمہ سہیل عظیم آبادی ۱۹۴۸ء ص ۱۸، ۱۷)

فکر نے ایک تعمیری مقصد کے لیے اپنی یہ ڈائری لکھی ہے۔
فکر کے پیش نظر ہندوستانیوں کو اور پاکستانیوں کو ان کی کمزوریاں اور
خامیاں دکھا کر یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ آئندہ ایسی غلطی کو نہ دہرائیں جس
سے خود ان ہی کا نہیں انسانیت کا بھی نقصان ہے۔ انھوں نے اپنی اس ڈائری
میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ سامراجی بازی گر اپنی آخری چال
چلتے ہوئے کیسا خطرناک کھیل کھیل گئے ہیں اور اگر سامراجیت سے برصغیر
کے لوگ اب بھی اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھیں تو پھر ان کا خدا ہی حافظ ہے
جو سامراجیت اپنے صرف ایک جھٹکے میں ایسا ہولناک زلزلہ پیدا کر سکتی
ہے اس کا دوسرا جھٹکا کس شدت کا اور کیسا خوفناک ہو سکتا ہے۔
اس طرف فکر نے برصغیر کے لوگوں کی توجہ کو مبذول کرنے کی کوشش کی ہے

وہ اپنی ڈائری کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

یہ کہانی ان تین مہینوں کے گرد گھومتی ہے جو تقسیم ہند فرقہ وارانہ فسادات اور تبادلہ آبادی کی تبدریج عظیم ترین تاریخی غلطیاں سرزد کی جارہی تھیں۔ میں یہ تین ماہ لاہور ہی میں گزارے وہ لاہور جو معیاری تہذیب و تمدن کا مرکز تھا اور ایک ہی سامراجی جھٹکے سے آگ اور خون کا دریا بن گیا تھا اور یہ دریا پھیلتے پھیلتے خوب صورت اور خوش حال پنجاب کے کونہ کونہ تک پہنچ گیا تھا اور پھر اس دریا کی موجوں پر مذہبی حیوانوں نے وہ کھیل کھیلا تھا جس پر تاریخ شرما گئی۔ فلسفہ کا دم رک گیا اور سائنس نے اپنا دھڑکنا بند کر دیا تھا۔"

فکر نے لاہور میں جو کچھ دیکھا تھا اس کو انھوں نے اپنی اس ڈائری میں قلمبند کر دیا ہے۔ تقسیم ہند کے ہول ناک واقعے ایسے رہے ہیں کہ ان کو دیکھنے کے بعد ایک فرشتہ بھی شیطان بن جائے تو بن جائے تو کوئی اہم بات نہ ہو، لیکن ایسے میں اپنی انسانیت کو قائم رکھنا اور انسان وانسانیت کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا لینا بڑا مشکل کام تھا۔ لیکن فکر ایسے حالات میں بھی جس صبر وضبط سے کام لے کر اپنے طنز میں بھی جو رکھ رکھاؤ پیدا کرتے ہیں وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں فکر کے طنز میں ان خطرناک حالات کو دیکھنے اور ان میں سے گزرنے کے باوجود زہرناکی نہیں آئی ہے۔ حالانکہ اس کے بعد اگر وہ زہر میں بجھے ہوئے طنز کے تیر برساتے تو بھی بے جا نہ ہوتا۔ لیکن

فکر انسان ہیں اور بعد میں سب کچھ اور وہ اپنے اشرف المخلوقات ہونے کے اس بار کو کٹھن حالات میں بھی سنبھالے رہنے کی تاب رکھتے ہیں اور اپنے انسان اور صرف انسان ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس کے تعلق سے سہیل عظیم آبادی چھٹا دریا کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

ہندوستان و پاکستان کا نہیں وہ اس کفر و ایمان کی نئی سرحدوں کا قائل نہیں۔ وہ ان پابندیوں سے بہت بلند اور ارفع ہے اسکی ایک منزل ہے۔ جسے وہ خوب اچھی طرح سے واقف ہے۔ جدھر سے ہو کر اسے اپنی منزل تک پہنچنا ہے۔ اس لیے وہ اس طوفان میں بھی اپنا راستہ نہ بھولا۔ جب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔"

(چھٹا دریا صہ ۱۹)

فکر کا طنز اصل میں اسی اندھیرے میں روشنی ڈھونڈنے کا فن ہے۔ فکر گھپ اندھیرے میں بھی امید کی کرن کے سہارے زندہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ فکر کی یہ امید پروری ہی ہے جس کی وجہ سے وہ ایک معروضی نقطۂ نظر سے چیزوں کو دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ ان کے طنز میں اسی وجہ سے کبھی ہجو کا رنگ نہیں آتا اور وہ کسی صورت میں بھی دشنام طرازی پر نہیں اترتے بلکہ ان کی وسعت قلب ہمدردی ہر حال میں قائم رہتی ہے۔ چھٹا دریا ایک ڈائری کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس سے فکر کی اس خصوصیت پر روشنی پڑتی ہے۔

"بلڈنگ کی دوسری منزل پر لکھا ہوا تھا۔" بشن داس بلڈنگ

پچھلی منزل کے متعلق معلوم ہوا کہ کسی بک بائینڈر کی دوکان تھی جہاں ہر روز بیسیوں مزدور مل جل کر قرآن مجید کی جلد بندی کیا کرتے تھے دونوں جل رہے تھے۔ ہندو کی بلڈنگ اور مسلمان کا قرآن مجید۔ اوپر کی منزل پر ایک لوہے کی بھاری بھرکم گارڈر کے نیچے دبے ہوئے ایک آٹھ سالہ بچے کی نعش کو لوگ نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اوپر بشی داس کا بچہ جل رہا تھا۔ نیچے محمد کا قرآن جل رہا تھا۔ خدا کا قانون جل رہا تھا اور ہندو اور مسلمان مل کر آگ بجھا رہے تھے۔ ایک میان میں دو تلواریں سما رہی تھیں۔"

(چھٹا دریا صہ ۲۷)

فکر کے اس اقتباس سے ان کی وسیع القلبی اور روشن دماغی پر روشنی پڑتی ہے انھوں نے ایک ایسے موقع پر جہاں اس بات کی پوری گنجائش تھی کہ مسلم فرقہ پرستوں کی کرتوتوں کو جانب داری کے ساتھ بے نقاب کیا جا سکتا تھا۔ وہاں بھی بڑے ہی توازن کے ساتھ بڑے ہی صبر و ضبط کے ساتھ اور بڑی ہی عمدگی سے اس بات کو پیش کیا ہے کہ تخریب میں سب ہی کا نقصان ہے اور جب کوئی قوم یا مذہبی دیوانگی دوسرے کے درپئے آزار ہوتی ہے تو وہ خود بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دوسرے کے گھر کو آگ لگانے میں اکثر اوقات اپنا بھی ہاتھ جھلس جاتا ہے اور وہ آگ خود اپنے گھر کو بھی جلا کر خاک کر سکتی ہے۔ فکر کی اس خصوصیت کی وجہ سے ان کا طنز کبھی بھی تنگ دلی اور تنگ نظری کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ کبھی ہجو کی منزل پر نہیں پہنچتا اور نہ کہیں

اس پر دشنام طرازی کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک اچھے اور صحت مند طنز کی روشن دلیل ہے۔ ایک اچھے طنز نگار کا طنز فکر انگیز ہوتا ہے۔ وہ ہر عمل کے حسن و قبح پر بڑی خاموشی سے روشنی ڈالتا ہے اور اپنے طنز میں ایک خاص وقار اور دلآویزی اور دلپذیری پیدا کرتا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نے ایسے ہی طنز کو اعلیٰ ادب میں شمار کیا ہے۔ وہ ایسے طنز کی خصوصیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کن حالات میں طنز ہجو بن جاتا ہے اور کس طرح وہ اعلیٰ ادب کی صورت اختیار کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"کینہ پروری طعن و تشنیع اور دشنام طرازی کا رنگ پیدا ہو جائے گا تو طنز نگاری ہجو کے حدود میں داخل ہو جائیگی طنز میں فراخ دلی وسیع القلبی اور انسانی ہمدردی کے عناصر نظر آئیں تو طنز اعلیٰ ادب بنتا ہے۔ حالات کو بہتر بنانے کی خواہش انسان دوستی کا جذبہ اور ذاتی غصہ کو پی جانے کی طاقت کے بغیر کوئی اچھا طنز نگار نہیں بن سکتا۔"

(ماہنامہ آج کل اگست ۴۷ء۔ احتشام حسین ص ۳۵، ۳۶)

فکر کے طنز میں یہی خصوصیت ہر جگہ ہوتی ہے۔ ان کی یہ ڈائری ان کے طنز کی اس خوبی کا مظہر ہے حالانکہ انھوں نے جن حالات میں اور جس ماحول میں لکھی ہے اس میں وسیع القلبی، ہمدردی اور فراخ دلی کی بہت کم گنجائش تھی۔ لیکن فکر کے طنز کی یہی خوبی ہے کہ وہ کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی اپنے طنز کی آن بان پر حرف آنے نہیں دیتے۔

فکر نے یہ ڈائری اپنے چشم دید حالات ہی کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ یہ

گویا فکر کی آپ بیتی ہے۔ یہ ڈائری ۹ر اگسٹ ۱۹۴۷ء "اندھیرے کے ریلے" میں شروع ہوتی ہے۔ اور ۷ر نومبر سنہ ۱۹۴۷ء "آؤ پھر صبح کو ڈھونڈیں" کے عنوان پر ختم ہوتی ہے۔ اندھیرے کے ریلے میں بہتے ہوئے فکر کا چھوٹا دریا صبح کو ڈھونڈنے کی لگن پر ختم ہوتا ہے۔ یہ بات خود فکر کے یاس انگیز حالات میں بھی رجائی نقطۂ نظر کو ظاہر کرتی ہے۔ فکر انسانیت کی اس بھیانک تذلیل میں بھی عظمت آدم پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی طنز نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت اور درخشندہ پہلو ان کے احترام آدم سے عبارت ہے۔ اس ڈائری کا ہر صفحہ فکر کے اس فکر انگیز طنز نگاری کا روشن ثبوت ہے۔ یہاں اس بات کا موقع نہیں ہے کہ فکر کی ڈائری کے مختلف حصوں کو پیش کر کے ان کی انسان دوستی ہندوستان سے محبت پاکستان کے خلوص، گنگا جمنی تہذیب کی بربادی کا ماتم اس کے ساتھ ہی ایک نئی تہذیب کے طلوع ہونے پر یقیناً فرقہ پرستوں کی تنگ دلی اور سخت دلی، روشن خیالوں کی انسان دوستی اور انسانیت پرستی اپنے مصائب اور اس سے زیادہ دوسروں کی مصیبتوں کا احساس اپنے شب و روز میں خود کی نہیں بلکہ انسان اور انسانیت کی بنتی بگڑتی تصویریں خیر و شر کی لڑائی، تاریکی اور روشنی کی کشمکش غرض زندگی کے بے شمار پہلو ایسے ہیں جن کو فکر نے اپنی اس چھوٹی سی ڈائری کے ذریعہ احاطہ طنز میں لانے کی حد درجہ کامیاب کوشش کی ہے۔ اس لحاظ سے اس ڈائری کے متعلق کچھ کہنا، کہنے سے زیادہ اس کو پڑھنے کی ضرورت ہے یا اس کو پیش کرنے کی ضرورت ہے اور یہاں اس بات کی گنجائش نہیں ہے۔

لاہور میں فکر کی آنکھوں نے وہ مناظر بھی دیکھے ہیں جس کو پڑھنے کے بعد کوئی ایسا نہ ہوگا جو ان واقعات سے متاثر ہو کر پگھل نہ گیا ہو۔ کوئی آنکھ ایسی نہ ہوگی جو آنسو نہ بہائی ہو۔ دراصل فکر کے قلم میں حقائق کی روشنائی ہے جو کسی بھی واقعہ یا کسی بھی چیز کو دیکھنے کے بعد اس کی صحیح عکاسی کرواتی ہے۔ فکر نے تقسیم ہند کے وقت انسانی سروں کے انبار دیکھے۔ تڑپتی ہوئی لاشیں دیکھی تباہ ہوتے ہوئے مناظر و مساجد دیکھے شیر خوار بچوں کو سنگینوں پر دیکھا، غنڈوں کے بازوؤں میں معصوم جوانیاں دیکھیں لیکن فکر ان تمام حالات کو دیکھنے کے بعد ان حالات کی جو صحیح تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فکر تقسیم ہند کے سانحہ کے وقت اپنے آپ کو بالکل غیر جانب دار بنائے ہوئے تھے جلتے ہوئے مکانوں کا وہ ایک منظر اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"ادھر سندر کے آگے سڑک پر مکانوں کی ایک طویل قطار
بھڑبھڑاتی ہوئی آگ میں رقص کر رہی تھی۔ یوں محسوس
ہوتا تھا جیسے اب مکانوں کو جلنے کی عادت سی ہوگئی ہے
جیسے یہ ان کے روزمرہ میں داخل ہو چکا ہے۔"

(چھٹا دریا ص ۵۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ فکر اشتراکی ذہن کے مالک ہیں لیکن فکر کا یہ رجحان بھی دیکھئے۔ جو وہ اس سانحہ کے وقت مختلف مذاہب کے احترام کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ مذاہب سے ان کا یہ احترام ملاحظہ ہو۔

"یہہ ترنگا تو ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں،
اچھوتوں اور نہ جانے کتنی ہی الم غلم قوموں کا جھنڈا
ہے۔ لیکن گروہ کا جھنڈا ان سب سے بلند ہے۔ دھرم
کا جھنڈا مذہب کا جھنڈا ہندو کا جھنڈا مسلمان کا
جھنڈا اور سکھ کا جھنڈا۔"

(چھٹا دریا ص۵)

فکر کا طنز اس وقت شدید صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جب وہ کسی بھی اخلاقی کمزوری، سماجی برائی یا آئینی شکستگی انھیں متاثر کرتی ہے۔ وہ کسی بھی واقعہ کی روح سے متاثر ہوتے ہیں اور پھر اپنے قلم کی نوک سے طنز کے وہ الفاظ صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں، جس کو پڑھنے کے بعد ایک عام قاری جس کے سینے میں حساس دل ہے۔ اس کے طنز سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فسادات کے موقعوں پر فوج یا پولیس کسی ایک طبقہ کی اگر ہم خیال ہو جائے تو نہ صرف فساد مچانے والوں کو اور زریں مواقع حاصل ہوتے ہیں بلکہ ان کی ہمتوں میں ایک دوسرا خون موجیں مارنے لگتا ہے۔ فکر نے جلتے ہوئے مکانات پر جو پولیس متعین کی گئی تھی۔ ان جلتے ہوئے مکانات اور پولیس کی تعیناتی کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

"جلتے ہوئے مکانات کا دل فریب منظر دیکھنے کے لیے
پولیس تعینات کر دی گئی تھی۔" (چھٹا دریا ص۴۲)

غرض کہ فکر کی یہ ڈائری جہاں تقسیم ہند کے سانحہ کو اور سانحہ میں ہونے والے واقعات کو پیش کرتی ہے وہیں فکر کی طنز نگاری کی اس خصوصیت کو بھی پیش کرتی ہے جسے سچا طنز، حقیقی طنز، مبالغوں سے مبرا طنز کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ○

تنقید نگاری

فکر ایک اچھے اور باشعور نقاد بھی ہیں۔ یہ بات بھی شائد بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ فکر جس زمانے میں ادب لطیف سے وابستہ تھے۔ یہ زمانہ سنہ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ کا ہے۔ فکر اس دوران ادب لطیف میں بعض وقت "تنقیدی جھلکیاں" کے عنوان سے مختلف تنقیدی مضامین لکھتے رہے ہیں۔ اس طرح بعض وقت "سخن گسترانہ بات" کے عنوان سے بھی اپنے تنقیدی خیالات پیش کیے ہیں۔ تنقید کے لیے جس علمیت متوازن ذہن اور فکری کاوش کی ضرورت ہوتی ہے وہ پوری طرح فکر کے تنقیدی مضامین میں نمایاں ہے۔ فکر کی تحریروں کی ایک خاص خصوصیت جو ان کی ہر تحریر میں نمایاں ہوتی ہے اور ان کی تخلیق میں بھی یہ چیز خاص طور پر واضح ہے کہ وہ بڑے ہی اعتدال کے ساتھ، بڑے ہی ضبط و سکون کے ساتھ چیزوں کو دیکھتے اور دکھاتے ہیں اور شائد فکر کی یہ تنقیدی بصیرت ہی کی وجہ سے ہے کہ فکر ہر جگہ بڑے ہی متوازن اور بڑے ہی

معتدل انداز سے اپنی ہر بات کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے پاس کبھی بھی جذباتیت نہیں ملتی وہ کہیں بھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوتے بلکہ ان کی ہر تحریر میں اور اس طرح سے ان کی تنقیدوں میں بھی فکر اور جذبہ کا بڑا ہی سنبھلا ہوا اور کانٹے پر تلا ہوا انداز ملتا ہے۔ فکر حد درجہ جذباتی موضوعات اور موقعوں پر بھی بڑی فکر انگیز باتیں کہنے پر قادر رہتے ہیں۔ فکر نے گو تنقید کی طرف بھی کبھی سنجیدگی سے توجہ نہیں کی لیکن جتنے کچھ ان کے تنقیدی خیالات ملتے ہیں وہ اس بات کا پتہ صاف طور پر دیتے ہیں کہ ان کے اندر ایک اچھا نقاد بھی چھپا بیٹھا ہے۔ لیکن فکر نے اس طرف توجہ نہیں کی ورنہ اُردو کے اچھے نقادوں میں ایک اور نقاد کا خوش گوار اضافہ ہو جاتا۔

تنقید کے بارے میں عام طور سے یہ بات دیکھی گئی ہے کہ اچھے فنکار ہی بڑے نقاد بھی گذرے ہیں۔ گذشتہ زمانے میں تو صرف فن کار یا ادیب یا شاعر ہی نقاد کا منصب بھی سنبھالے ہوئے تھے۔ اُردو تنقید کے قدیم سرمایہ پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے سارے کے سارے نقاد شاعر بھی تھے۔ اُردو کے قدیم اور بڑے شعرا نے اپنی تنقیدی بصیرت اور تنقیدی بصارت کا بہترین ثبوت اپنے تذکروں میں پیش کیا ہے۔ میر تقی میر کا "نکات الشعراء" آج بھی اردو تنقید میں اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے بڑی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ اس طرح سے میر حسن بھی اپنے تذکرے میں مصحفی اور قدرت اللہ قاسم اپنے تذکروں میں اور دوسرے کئی شاعر ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اپنے تذکروں میں اپنے تنقیدی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ یہ سلسلہ ایک طرح سے آج تک بھی چل رہا ہے۔

اردو تنقید کا جدید عہد بھی ایسے ہی شاعر نقادوں کی تنقیدی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ محمد حسین آزاد کی "آب حیات" اور الطاف حسین حالی کی مقدمہ شعر و شاعری اور شبلی کی "شعر العجم" ایسی کتابیں ہیں جو تنقید کی "ٹکسالیں" کہی جا سکتی ہیں۔ ان کتابوں سے اردو تنقید کا عہد زرین شروع ہوتا ہے۔ خاص طور پر الطاف حسین حالی تو جدید اردو تنقید کے "باوا آدم" کہے جا سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں بھی کئی شاعر ایسے ہیں جنہوں نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کی وجہ سے اردو تنقید میں اہم مقام بنا لیا ہے۔ جیسے فراق گورکھپوری، ڈاکٹر وزیر آغا، خلیل الرحمن اعظمی، سردار جعفری، ڈاکٹر وحید اختر، احتشام حسین اسی طرح بعض اور نام بھی ملتے ہیں۔

اردو کے بعض دوسرے سربرآوردہ نقاد ایسے بھی ہیں جو بہ حیثیت شاعر کے بہت زیادہ معروف نہیں ہیں لیکن وہ بھی شعر کہتے ہیں۔ جیسے آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام کلیم الدین احمد، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر مغنی تبسم وغیرہ۔ یہاں تمام ناموں کے اظہار سے مقصود یہ ہے کہ اچھا فن کار عام طور پر اچھا نقاد بھی ہوتا ہے فکر بھی شاعر اور انشا پرداز ہیں۔ اس وجہ سے ان کی تنقید بھی ایک خاص گہرائی اور وزن رکھتی ہے۔ ان کی تنقیدوں میں اہم تنقیدی شعور ملتا ہے۔

فکر نے ادب لطیف لاہور میں وقتاً فوقتاً جن تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں ایسی تنقیدیں بھی ملتی ہیں جس میں تنقیدی بصیرت اور اعتدال بھی پایا جاتا ہے۔ اس زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے اور خود فکر کی عمر اور ان کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات پر

حیرت ہوتی ہے کہ فکر اس زمانے میں بھی کیسی گہری تنقیدی فکر رکھتے تھے۔ فکر نے جس زمانے میں یہ تنقیدی مضامین لکھتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہر نئی چیز کو لبیک کہا جارہا تھا اور ہر جدت کو سراہا جارہا تھا۔ آزاد شاعری معرّا شاعری کا بول بالا تھا اور نئی بات کہنا اور جدت پیدا کرنا مستحسن سمجھا جارہا تھا لیکن اس وقت بھی جبکہ فکر خود آتش بجنے ہوئے تھے اور ان کے ایک طرح سے عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ ایسے میں ہر نئی بات اچھی معلوم ہوتی ہے اور نئے فن اور جدت کے شوق میں ہر اصول اور ہر ضابطہ کو بالائے طاق رکھ دینا کوئی معمولی بات نہیں ہوا کرتی۔ لیکن فکر اس زمانے میں بھی بڑی فکر رکھتے تھے اور اعتدال و توازن کی اہمیت کو بڑی شدت سے محسوس کرتے تھے۔ وہ جدت کے شوق میں حد سے گزر جانے والوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"اسلوب میں نیا پن پیدا ہو رہا ہے۔ رجحانات بدل رہے
ہیں۔ زاویئے جدید ہیں تو ہوا کرے، جو انکار کرے وہ مجرم
لیکن بات کرنے کے طور طریقے تو ڈھنگ کے ہوں۔
مصرعوں کی جوڑ توڑ تو کسی ڈھب سے ہوں، یہ نہیں کہ جدت
کی اچھل پھاند میں فن کی حدیں بھی پھلانگ جاؤ۔"

(ماہنامہ ادب لطیف لاہور ستمبر ۱۹۴۳ء)

اس سلسلے میں آگے چل کر فکر یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہر بات میں اعتدال و توازن کتنا ضروری ہے۔ فکر جدت کو بھی پسند کرتے ہیں اور ابہام کی اہمیت کو بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک فن کار کا کام اور خاص طور پر ایک اچھے فن کار کا کام یہ ہے کہ وہ ہر جگہ اور ہر صورت میں توازن سے کام لے۔

ادب میں ایسی جدّت پیدا کرنا جو صرف جدّت برائے جدت کی تعریف میں آئے جس سے فن کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان پہنچ جائے۔ فکر کے نزدیک بے معنی حرکت ہے اور اس کو وہ اچھل پھاند کا نام دیتے ہیں۔ ادب میں ایسی اچھل پھاند جس میں فن کی حدیں بھی پھلانگ لی جائیں بے ادبی میں داخل ہیں۔ اس طرح سے ابہام میں بھی ایک حد ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ابہام کی حدیں اہمال سے جا ملتی ہیں اور یوں فن تخلیق بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ فکر ابہام کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے حد سے بڑھے ہوئے ابہام پر تنقید کرتے ہیں اور اپنے تنقیدی خیالات "سخن گسترانہ" میں یوں اظہار کرتے ہیں۔

> "اور پھر وہ ابہام کا بکھیڑا سلجھنے میں ہی نہیں آتا یعنی ابہام کو جو ڈھیل دی گئی ہے تو اہمال سے جا بھڑا یا نقاب پوشی آرٹ کی جان ہے، لیکن ایسا بھی کیا کہ نقاب ہی نقاب رہ جائے اور جان نقاب غائب غلّہ کر دی جائے۔"

(ماہنامہ ادب لطیف لاہور ستمبر ۱۹۴۲ء ص ۲۶)

فکر ابتداء ہی سے مارکزم کی طرف مائل رہے ہیں وہ ادب میں سماجی حقیقت نگاری کو ضروری اور لازمی سمجھتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ ادیب کا سماج میں ایک اہم مقام ہے اور ادیب کا کام صرف اپنی ذات کی دنیا ہی میں گم رہنا اچھا نہیں ہے بلکہ اسے اپنی ذات سے باہر آ کر خارجی زندگی کو دیکھنا بھی ضروری ہے اور خارجی دنیا کے لیے اس کی بھلائی کے لیے اس اس کی ترقی کے لیے کام کرنا بھی لازمی ہے۔ ہر دور میں ہر زمانے میں زندگی کے ہر موڑ پر ادیب کا اپنا ایک فریضہ ہوتا ہے جس کو اسے پورا کرنا چاہیئے۔

لیکن فکر ان ادیبوں میں سے نہیں ہیں جو صرف نعرہ بازی کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ وہ ادبی قدروں کو بھی ملحوظ رکھنے پر زور دیتے ہیں۔ فکر ان ادیبوں میں سے نہیں ہیں۔ جو زندگی کے مطالبات کو پیش کرنے میں ادب کے مطالبات سے منحرف ہونے یا اسے نظر انداز کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ فکر ادب کی قدر و قیمت کو بھی برقرار و قائم رکھنے پر زور دیتے ہیں اور ساتھ ہی ادیبوں اور شاعروں سے یہ بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ زندگی کے مسائل اور زندگی کو سلجھانے میں اپنے نوکِ قلم سے بھی کام لیں۔ وہ سنہ ۱۹۴۷ء میں جو ہندوستان میں ہنگامے ہو رہے تھے۔ قتل و غارت گری کا جو بازار گرم تھا اور انسانیت کی جتنی اور جیسی تذلیل ہو رہی تھی۔ اس کی طرف ادیبوں کو متوجہ کرتے ہوئے اپنے تنقیدی مضمون "سخن گسترانہ" میں ایک جگہ یوں لکھتے ہیں۔

> "ہندوستان آرٹ اور ادب سے بھرپور ہندوستان اخلاق و تہذیب کا گہوارہ، ہندوستان لطافت و نکہت کا مجموعہ ہندوستان مذہب کی لاش کو انگشن دے کر خون کی ہولی کھیلتا رہا اور ہم چپ رہے۔ ہمارے قلم پر مہریں لگی رہیں آخر کیوں، کس لیے، کیا اس لیے کہ ہماری خاموشی مستقبل کی خوف ناک تعمیر میں حصہ لے کیا اس لیے کہ ہمارے سامنے برسوں کی سینہ کاری کی اہانت ہو کیا آپ نہیں جانتے کہ یہ خاموشی ہمارے نئے فن اور ادب کے دروازے بند کر دی ہے۔"

(ماہنامہ ادب لطیف لاہور۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۷ء ص ۳۰)

فکر کا یہ کہنا کہ یہ خاموشی ہمارے نئے فن کا دروازہ بند کر دی ہے۔ ان کے گہرے تنقیدی شعور کو ظاہر کرتا ہے۔ فکر یہ بات گویا بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ ادب میں نئے موضوعات نئے خیالات نئی اصناف زمانے کے نئے حالات کے مطابق آتی ہیں۔ اصل میں نیا فن، نئی زندگی کی نشاندہی کی طرف اور نئے حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ادب میں نیا پن اور نئی جدتیں حقیقی معنوں میں اس وقت اہمیت رکھتی ہیں جبکہ یہ نئی بات کہنے کے لیے نئے واقعات کو بیان کرنے کے لئے زندگی کے نئے مسائل کو پیش کرنے کے لیے وجود میں آئیں۔ فن میں نئے تجربوں اور نیا پن کا یہی مفہوم اہمیت رکھتا ہے ورنہ فن میں نیا پن صرف نئے پن کے لیے یا پرانی شراب کو نئے پیمانے میں پیش کرنے کے لیے اگر ہو تو کوئی اہمیت نہیں رکھتا اصل میں نئی بات، نئی چیزیں اور نئے حالات ہی نیا فن پیدا کرتے ہیں۔ فکر نے اس اہم ترین بات کی طرف اشارہ کر کے اپنی تنقیدی بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے۔

فکر نے اپنے دوسرے مضمون "ادب اور ریاست" کی وفاداری کے سلسلے میں بعض اہم باتیں چھیڑی ہیں۔ وہ اس اہم بحث کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کسی بھی ریاست میں ادیب کا کیا رول ہونا چاہیے اور اسے ریاست کا کس حد تک وفادار ہونا چاہیے۔ یہاں شاید فکر نے اشتراکی نقطۂ نظر سے ادیب کا رول جو ریاست میں ہو سکتا ہے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ادیب کا رول جو ریاست میں ہو سکتا ہے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ادیب اور سیاسی نظام میں جو رشتہ ہونا چاہیے اس پر بھی

فکر نے روشنی ڈالی ہے۔ یہاں فکر نے اس بات کو بھی بڑی خوبی سے واضح کیا ہے کہ ادیب کی وفاداری ریاست سے کن باتوں پر منحصر ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ وہ اس اہم مسئلہ پر اپنے متوازن خیالات کا اظہار کر کے اپنی تنقیدی میانہ روی پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

> جب یہ کہا جاتا ہے کہ ادیب کو ریاست کا وفادار ہونا چاہیے تو اس وقت سب سے اولین اور اہم ضرورت ریاست کی ترتیب و تشکیل اس کی ہیئت اور اس کے معاشرے کی اور سیاسی رجحانات کو سمجھنے کی ہوتی ہے جبکہ ہم کسی ریاست کے آئینی ڈھیچر اور اس کے اثرات و مطالبات پر غور نہیں کریں گے۔ ہم کسی ادیب کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ وفاداری کا دم چھلہ لگائے پھرے"

(ماہنامہ ادب لطیف لاہور جولائی ۴۸ء صفحہ ۸۲)

اس طرح سے فکر نے اپنے بعض دوسرے مضامین میں بھی اپنے واضح تنقیدی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ گو ان کے تنقیدی مضامین کمیت کے اعتبار سے کم ہیں لیکن کیفیت کے اعتبار سے ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ تنقیدی مادہ جو فکر میں موجود تھا اور اس خاکستر میں یہ چنگاری بھی تھی اگر اس کو تھوڑی سی ہوا دی جاتی تو یہ کبھی ایک شعلہ بن کے بھڑک اٹھتا اور بہت ممکن تھا کہ اس شعلے کی فراوانی سے اردو کا "ایوان تنقید" اور بھی جگمگا اٹھتا۔ لیکن فکر کی ان تنقیدی کاوشوں کو دیکھتے ہوئے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ع حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

کالم نگاری

اُردو میں طنز و مزاح کو فروغ دینے میں کالم نویسی کو بڑا دخل حاصل رہا ہے۔ کالم نویسی کا رواج اردو صحافت میں اودھ پنچ سے باقاعدہ طور پر شروع ہوتا ہے۔ اودھ پنچ سے بہت پہلے اُردو صحافت کے آغاز ہی سے طنزیہ کالم لکھے جاتے رہے ہیں۔ "اُردو اخبار" جسے مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر ۱۸۳۶ء سے نکالا کرتے تھے۔ اس میں بھی طنز کی جھلکیاں اور مزاح کے چٹخارے کہیں کہیں اور کبھی کبھی نظر آجایا کرتے ہیں۔ اُردو اخبار کی خصوصیت کے بارے میں مصنف "اردو صحافت" بدر شکیب لکھتے ہیں:

"اس اخبار میں انگریزی عملداری پر سنجیدہ تنقید کی جاتی تھی جو بعض اوقات طنز کی صورت اختیار کر لیتی تھی جس سے اس زمانے کے حالات اور انگریز دشمنی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"

(اردو صحافت از بدر شکیب ص ۱۲۳)

لیکن حقیقی معنوں میں طنز و مزاح کا آغاز اُردو صحافت میں اودھ پنچ ہی

سے ہوتا ہے۔ اودھ پنچ کے سب ہی لکھنے والے اس زمانے کے چوٹی کے اہل قلم رہے ہیں جن میں بعض نے بعد میں اردو ادب کے طنز و مزاح کو نئی بلندیوں سے آشنا کیا۔ ان میں خاص طور پر منشی سجاد حسین، سید محمد آزاد، رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی جوالا پرشاد برق، عبد الغفور شہباز، محفوظ علی بدایونی قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر مستقل طور پر اور مسلسل اودھ پنچ میں لکھتے رہے ہیں۔ بعض تو ایسے بھی رہے ہیں جو اودھ پنچ کے مستقل کالم مختلف ناموں سے لکھتے رہے۔ ان میں خاص طور پر سید محمد آزاد، محفوظ بدایونی قابل ذکر ہیں۔ اودھ پنچ کی یہ روایت اردو صحافت میں اتنی مقبول ہوئی کہ آج تک اس کا سلسلہ چل رہا ہے۔ ایک اور بات جو اردو اخباروں کی کالم نویسی میں اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ یہ طنز و مزاح کے کالم نگار ہمیشہ ہی چوٹی کے ادیب اور شاعر رہے ہیں۔ بعض وقت تو ایسا بھی ہوا ہے کہ تمام صحافتی کالموں میں صرف طنز و مزاح کا کالم ہی ادبی رہا ہے۔ اور آج بھی عام طور پر صحافتی خشکی کو اور بے رنگی کو کم کرنے کے لیے ادبی چاشنی و رنگینی پیدا کرنے کے لیے طنز و مزاح کا یہی کالم تسکین دل و جان ہوا کرتا ہے۔

اردو اخباروں کی طنزیہ کالم نگاری کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات صاف طور پر نمایاں ہو جاتی ہے کہ اردو کے بڑے اہم اور اچھے ادیب بھی عام طور پر اس سے منسلک رہے ہیں۔ اودھ پنچ کے بعد جو اخبار اردو صحافت بلکہ اردو ادب میں بھی اہمیت رکھتا ہے وہ "الہلال" ہے۔ جس میں مولانا ابو الکلام آزاد جیسے جلیل القدر ادیب "افکار و حوادث" کے نام سے مستقل طور پر ایک کالم لکھا کرتے تھے۔ یہ طنز و مزاح کا کالم آج بھی اردو طنز و مزاح کا افتخار کہا جا سکتا ہے۔ بعد میں اس کالم کو مولانا غلام رسول مہر جیسے بلند پایہ ادیب لکھتے رہے۔

"افکار و حوادث" کا یہ نام اتنا مقبول ہوا کہ جب "زمین دار" لاہور سے نکلنے لگا تو اس میں بھی افکار و حوادث کا کالم مستقل طور پر لکھا جانے لگا۔ "زمین دار" کا یہ کالم مولانا عبدالمجید سالک لکھا کرتے تھے۔ ان کی طنزیہ و مزاحیہ تحریر کی وجہ سے اس کالم کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں جب مولانا عبدالمجید سالک زمیندار سے علیحدہ ہو گئے اور "انقلاب" نکلنے لگا تو اپنے ساتھ یہ کالم یعنی افکار و حوادث بھی ساتھ لے گئے اور اب مستقل طور پر انقلاب میں افکار والا کالم چھپنے لگا۔ جس زمانے میں انقلاب نکلا کرتا تھا اس زمانے میں مولانا چراغ حسن حسرت "نئی دنیا" جو کلکتہ سے نکلا کرتا تھا اس میں فکاہی کالم "کولمبس" کے نام سے لکھنے لگے۔ پھر جب وہ پنجاب گئے اور زمین دار سے وابستہ ہو گئے تو انھوں نے "سندباد جہازی" کے فرضی نام سے ایک فکاہی کالم لکھنا شروع کیا۔ بعد میں جب "احسان" نکلنے لگا تو وہ سندباد جہازی ہی کے نام سے کالم لکھتے رہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت ان اخباروں کے علاوہ "شہباز" "شیراز" "پنچایت" "مہاجر" "امروز نوائے وقت" میں میں بھی فکاہی کالم لکھا کرتے تھے۔

فکاہی کالم کو امتیازی مقام بخشنے میں محمد علی جوہر کا اخبار "ہمدرد" بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں وہ خود بھی طنز و مزاح کے تیر برساتے تھے اور سید محفوظ علی بدایونی بھی اس میں لکھا کرتے تھے۔ سلطان حیدر جوش "بمبوق" کے نام سے ہمدرد میں طنز و مزاح کا کالم ایک مدت تک لکھتے رہے۔

طنز و مزاح کے کالم کے ذریعہ جن ادیبوں نے طنز و مزاح کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔ ان میں مولانا عبدالماجد دریا بادی، قاضی عبدالغفور دیوان سنگھ مفتون، مے کش حیدر آبادی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی اپنے اخبار "صدق" میں آج تک بھی "سچی باتیں" کے نام سے اپنا طنز و مزاح کا کالم لکھتے ہیں۔ طنز و مزاح کے کالم نویسوں میں مجید لاہوری کا "نمکدان" بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی "عنقا" کے نام سے لاہور سے نکلنے والے اخبار امروز میں "حرف و حکایت" کا طنزیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ معروف اور اہم ادیبوں میں جو ادیب طنز و مزاح کا کالم لکھتے رہے ہیں ان میں شوکت تھانوی اور ابن انشا دیہ دونوں اخبار "جنگ" میں فکاہی کالم لکھتے رہے ہیں۔ جنگ سے ایک اور مشہور و معروف ادیب جو کالم نویس کے سلسلے میں وابستہ رہے ہیں ان میں ابراہیم جلیس کا نام بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انتظار حسین "آفاق" اخبار میں فکاہی کالم ایک عرصہ تک لکھتے رہے۔ حیدر آباد سے نکلنے والے روزنامہ سیاست میں مشہور شاعر شاہد صدیقی "کوہکن" کے نام سے طنزیہ و مزاحیہ کالم "شیشہ و تیشہ" لکھا کرتے تھے۔ شاہد صدیقی کے انتقال کے بعد اس کالم کو مشہور طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین پابندی سے لکھ رہے ہیں۔ روزنامہ رہنمائے دکن میں بھی "رہنما و راہرو" کے نام سے فکاہیہ کالم لکھا جاتا تھا۔ اس طرح حیدر آباد ہی کے ایک اور روزنامہ انگارے میں "نمک پارے" کے نام سے فکاہی کالم چھپتا رہا ہے۔ روزنامہ منصف میں من موجی کالم چھپتا ہے اسی طرح ہفتہ وار بلٹز میں مشہور ادیب خواجہ احمد عباس "آزاد قلم" کے نام سے آخری صفحہ لکھا کرتے ہیں۔ بنگلور سے نکلنے والے روزنامہ "نشیمن" میں "چھیڑ چھاڑ" میں

چھپتا رہتا ہے۔ ساگر چند گورکھا روزنامہ پرتاب میں گپ شپ طنزیہ کالم تحریر کرتے تھے۔ نانک چند ناز، نصراللہ خاں عزیز، سید نجیب حسین، مہر مظفر احسانی، حمید نظامی، قمر اجنالوی، وقار انبالوی اور سید حبیب کے نام کالم نویسوں کی حیثیت سے اہمیت کے حامل ہیں۔ روزنامہ سیاست (یو۔پی) میں سید حبیب طنزیہ و مزاحیہ کالم "راز و نیاز" لکھا کرتے تھے۔ اور "ملت" میں قمر اجنالوی" کاروان ہاشمی" کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے۔ محمود سلطانہ روزنامہ "انجام" میں برق و شرر" کا کالم تحریر کرتی ہیں۔ رنبیر اور مسافر کی "چٹکیاں" ملاپ کے صحافتی کالموں میں طنز و مزاح کے مواقع فراہم کرتے تھے۔ اس طرح اُردو اخبارات میں طنز و مزاح کے کالم ہمیشہ شریک رہے۔

اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاروں میں فکر تونسوی اپنا ایک الگ منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ شاید اردو صحافت کی تاریخ میں ایسی مثال مشکل ہی سے ملے گی کہ کوئی کالم نگار اپنے کالم کو پچیس سال تک مسلسل لکھتا رہا ہو یہ بات خود فکر کو اُردو کے کالم نگاروں میں امتیازی مقام بخشنے کے لیے کافی ہے۔ فکر روزنامہ ملاپ سے سنہ ۱۹۵۵ء سے وابستہ ہیں۔ ملاپ دہلی حیدرآباد جالندھر اور لندن سے ایک ہی انتظامیہ کے تحت نکلتا ہے۔ ملاپ میں فکر تونسوی کا طنزیہ اور مزاحیہ کالم "پیازکے چھلکے" سنہ ۱۹۵۵ء سے آج تک چھپ رہا ہے۔ ان پچیس سالوں میں فکر نے کم و بیش چھ ہزار کالم لکھ ڈالے ہیں اور اس کالم کے ذریعہ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ اپنی جسامت کے اعتبار سے اتنا وقیع اور قابل توجہ بن چکا ہے کہ جو بات فراق گورکھپوری نے "شرر کی ناول نگاری" کے بارے میں کہی تھی وہ فکر پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے۔ فراق نے شرر کی ناول نگاری کے بارے میں لکھا تھا کہ ـــــ "ان کے ناولوں کی تعداد

اتنی ہے کہ وہ خواہ مٹی کا ڈھیر ہی سہی لیکن اس کو ایک بار ٹھٹک کر دیکھنا پڑتا ہے۔" فکر کی کالم نگاری کا بھی یہی حال ہے۔ البتہ یہ مٹی کا ڈھیر نہیں بلکہ یہ طنز و مزاح کا "کوہ ہمالہ" ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ طنز و مزاح کے تیر و تبر کا وہ شان دار "مخزن حرب" ہے جس میں سماجی ناانصافی، سماجی اصلاح، ملک کی خدمت انسان اور انسانیت کی خدمت اور ان کی مدافعت کے لیے ہتھیار جمع کیے ہیں۔

فکر نے شاعری صرف اس بنا پر ترک کی تھی کہ وہ جیسا کہ اس سے پہلے ذکر آچکا ہے۔ شاعری کے دامن کو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے تنگ محسوس کر رہے تھے اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ غم ذات کی کوئی پرچھائیں بھی ان کے زورِ قلم پر نہ پڑنے پائے۔ اس وجہ سے وہ شاعری ترک کر کے نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن اسباب کی بنا پر شاعری انھوں نے ترک کی وہ بذات خود قابل احترام ہے۔ فکر کا یہ جذبہ کہ وہ شاعری کرتے ہوئے انسان اور انسانیت کی جیسی چاہیے اور جتنی کہ وہ چاہتے ہیں خدمت نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ خدمت کا اتنا اور ایسا جذبہ بغیر شدید خلوص کے ممکن نہیں ہے۔ خلوص کا یہی جذبہ ہے جو فکر کی کالم نویسی کا امتیازی وصف ہے۔ اسٹیفنسن لیکاک نے مزاح کے بارے میں کہا تھا "مزاح کیا ہے یہ زندگیوں کی ناہمواریوں کی اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جن کا فن کارانہ اظہار ہو جائے۔" اصل میں یہ بات صرف مزاح ہی تک محدود نہیں ہے طنز پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے۔ طنز میں بھی زندگی کی ناہمواریوں کا شعور ضروری اور لازمی ہوتا ہے اور طنز میں عام طور پر مزاح شامل رہتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی مزاح کو طنز

سے اور طنز کو مزاح سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ فکر کے پاس بھی طنز کے ساتھ مزاح کا لازمی طور پر عنصر شامل رہتا ہے۔ اس لیے فکر کے طنز میں وہ زہرناکی نہیں ملتی جو سوئفٹ کے پاس ملتی ہے۔ فکر انسان سے ملک و قوم سے بڑی محبّت رکھتے ہیں اور ان کے طنز میں صرف تخریب ہی کا جذبہ نہیں ہوتا بلکہ تعمیر کی لگن بھی صاف طور پر نمایاں رہتی ہے۔ وہ صرف ان ہی چیزوں کو ختم کر دینا چاہتے ہیں جو بالکل از کار رفتہ ہو چکی ہیں اور جن کو بدلے بغیر سماج اور ملک کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہی ہمدردی ہے جو فکر کے طنز کو فن کاری میں تبدیل کرتی ہے۔ فکر نے جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ اب تک چھ ہزار کالم لکھ ڈالے ہیں اور ان میں سے صرف بیس پچیس کا انتخاب اسٹار پاکٹ بک سیریز نے سنہ ۱۹۶۵ء میں چھاپا تھا۔ حالانکہ اگر اب تک فکر کے کالموں کو اس طرح کتابی شکل میں چھاپا جاتا تو ایسی کم از کم دو سو کتابیں شائع ہو سکتی تھیں۔ گو یہ انتخاب بھی فکر کی طنز نگاری پر کسی حد تک روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فکر ملاپ سے وابستہ ہونے سے پہلے بھی کالم نویسی کرتے رہے ہیں بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کالم نویسی کا آغاز سنہ ۱۹۵۳ء میں ہوتا ہے۔ فکر کمیونسٹ پارٹی کا روزنامہ "نیا زمانہ" (پنجاب) کے لیے ایک کالم لکھا کرتے تھے۔ اور شاید اس کی بے انتہا مقبولیت کا نتیجہ ہے کہ بعد میں جب نیا زمانہ بند ہوا تو ملاپ نے فکر کو اپنے اخبار میں کالم نویسی کے لیے مدعو کیا۔ فکر کے کالم "آج کی خبر" کو جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی تھی اس کی تفصیل انھوں نے راقم الحروف کو اپنے ایک خط میں یوں لکھی ہے۔

"سنہ ۱۹۵۳ء میں کمیونسٹ پارٹی نے اپنا روزنامہ "نیا زمانہ" جالندھر سے شروع کیا تو پارٹی کے حکم پر یہاں بلا لیا گیا اور نیا زمانہ میں پہلی مرتبہ طنزیہ کالم آج کی خبر کے عنوان کے تحت روزآنہ لکھنا شروع کیا جو بے حد مقبول عوام و خواص ہو گیا اور پنجاب اور دہلی کے اخباروں میں ایک نیا دھماکہ ثابت ہوا۔"

(خط بہ نام راقم از فکر تونسوی)

فکر کے اس بیان سے یہ بات صاف طور پر واضح ہوتی ہے کہ آج کی خبر کی کامیابی ہی کی بنا پر فکر کو ملاپ نے اپنا لینے کی کوشش کی۔ اس بات کا ایک اور ثبوت یہ بھی ہے کہ فکر کے ملاپ سے وابستہ ہونے سے پہلے بعض دوسرے کالم نویس ملاپ میں طنز و مزاح کے کالم کو لکھا کرتے تھے۔ جیسے سنہ ۱۹۵۴ء میں کوئی تیر انداز تھے جو تیر نیم کش کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے۔ ان کے بعد پھول اور کانٹے کے نام سے جو طنزیہ کالم تھا اس کو کوئی باغبان تھے جو تحریر کیا کرتے تھے۔ باغبان کے بعد سنہ ۱۹۵۵ء کے تین چار ابتدائی مہینوں میں ستیا داری نوک جھونک کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے۔ لیکن ان کالموں کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوتی جو آج پیاز کے چھلکوں کو حاصل ہے۔

فکر کی طنز و مزاح کا محرک ان کا انسان اور انسانیت سے ہمدردی کا جذبہ ہے۔ وہ صرف ہندوستان ہی سے محبت نہیں کرتے ہندوستان ہی کی بہتری نہیں چاہتے بلکہ ان کے پیش نظر مجموعی طور پر انسانیت کی بہتری ہوا کرتی ہے۔ اس طرح سے ان کا طنز ایک بین الاقوامی حیثیت اختیار

کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے کہنے کے مطابق

"مزاح ایک قومی کارنامہ ہے اور طنز ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔

(اُردو ادب میں طنز و مزاح از ڈاکٹر وزیر آغا ص ۴۴)

فکر کا طنز بھی جو بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے اس کا اندازہ پیاز کے چھلکے" کے اس انتخاب کے دیباچہ سے لگایا جا سکتا ہے جسے فکر نے خود لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے خدا اور انسان سے بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اور (خاکم بدہن) خود خدا بھی پروپگنڈے کا سہارا لیتا رہا ہے مثلاً جب اس نے آفاق کی تخلیق کی تو اپنے پبلسٹی ایجنٹوں کی معرفت باقاعدہ اشتہار دیا کہ یہ میری بہترین تخلیق ہے۔ یہ اشرف المخلوق ہے ____ ذرا سوچیے اگر انسان کو عطر مان لیا جائے تو اس کے اپنے اندر سے خوشبو اٹھنی چاہیے تھی۔ خدا یعنی عطّار کو یہ کہنا پڑتا کہ میرا عطر بہترین ہے۔

(انتخاب پیاز کے چھلکے از فکر تونسوی مطبوعہ ۱۹۵۵ء)

فکر کا یہ طنز راست خدا کی ذات سے تھا اب فکر کے اس اس طنز کو ملاحظہ فرمایئے۔ جو وہ خدا کی مخلوق پر کرتے ہیں۔ یہاں ان کا طنز کچھ اور تیکھا ہوا جاتا ہے۔

"میں نے یہ کتاب اشرف المخلوقات یعنی انسان کے بارے میں لکھی ہے۔ اور خدا کے پروپگنڈے کا جواب دیا

ہے اور بات یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوق ہی نہیں
لچا بھی ہے عظیم ہی نہیں گھٹیا بھی ہے۔ ہم سب انسان
ادھورے ہیں مضحکہ خیز ہیں فکر تونسوی بھی ان میں
شامل ہے اور خدا کو اپنی جس تخلیق پر ناز ہے اسے اس
پر شرمندہ بھی ہونا چاہیے ممکن ہے خدا کو یہ کتاب پڑھ کر
اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔"

(انتخاب۔ پیاز کے چھلکے از فکر تونسوی ص۶۵)

اس طرح فکر خدا اور انسان دونوں پر اتنا گہرا اور تیکھا طنز کرتے ہیں۔ آرتھر کو لارڈ نے اس وجہ سے طنز نگار کے بارے میں یہ بات کہی تھی کہ۔

طنز نگار کے ساتھ زندگی بسر کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ وہ ضرورت سے زیادہ اپنے ساتھیوں کی کمزوریوں اور برائیوں کا احساس رکھتا ہے اور اس احساس کو ظاہر کیے بغیر بھی نہیں رہتا۔ اس کا موقف بڑا نازک ہوتا ہے نہ تو وہ اخلاقی برتری کا دعوی کر سکتا ہے اور نہی وہ ریاکار ہوتا ہے اس لیے وہ دوسروں میں کمزوریاں اور غلطیاں دیکھتا ہے اس کی مذمت کرتا ہے۔"

("سٹائیر" از آرتھر پولارڈ طبع ۱۹۷۰ء ص۱)

فکر کی طنز نگاری میں بھی اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ وہ کس طرح سے انسان کی کمزوریوں کو کس درجہ باریک بینی سے دیکھتے ہیں اور ان کمزوریوں کو نمایاں کر کے اس کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ شاید

کتے اُردو طنز و مزاح میں بڑا محدود عنوان رہا ہے۔ سرسید احمد خاں نے اپنے انشائیہ "بحث و تکرار" میں کتے اور انسان کی مماثلت کو نمایاں کرتے ہیں۔ پطرس کے کتے تو ہم کو بے تحاشہ ہنساتے ہیں اور کتوں سے بعض انسان جس طرح ڈرتے ہیں ان کی نفسیات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ کتے فیض احمد فیض کی توجہ کو بھی اپنی طرف منعطف کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ فیض نے اپنی نظم "کتے" میں ہندوستان کی غلامی پر طنز کیا تھا اور اس طنز کے ذریعہ ہندوستان کی سوئی ہوئی اور خوابیدگی کی ہوئی حالت کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن فکر کے کتے کئی لحاظ سے اپنی یہ منفرد شان رکھتے ہیں۔ کتوں کو استعارہ بنا کر فکر نے انسانی زندگی کی بعض بڑی کمزوریوں اور انسانی سماج کی بعض ناانصافیوں پر بڑی کڑی روشنی ڈالی ہے۔ وہ انسان اور کتوں میں بعض سماجی ناانصافیوں کی وجہ سے جو مماثلت پیدا ہو جاتی ہے اس کو اپنا بھرپور طنز کا نشانہ بناتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں

"کتوں کی سب سے بڑی قسم جسے میجاریٹی بھی حاصل ہے عوامی کتوں کی بھی ہوتی ہے اس قسم میں بھانت بھانت کی ذاتیں ہوتی ہیں۔ کئی بالکل پرولتاری ہوتے ہیں کئی عمر بھر رفیوجی رہتے ہیں۔ کئی بالکل اہنسا وادی ہوتے ہیں۔ کئی کلرکانہ ذہنیت رکھتے ہیں کہ روکھی، سوکھی کھا کر نلکے کا گندا پانی پی لیتے ہیں اور یوں ساری زندگی کاٹ دیتے ہیں کئی نہایت غنڈے ہوتے ہیں یعنی دوسرے کتے کا مال زبردستی چھین کر بھاگ جاتے ہیں۔ کئی بڑے ڈپلومیٹ

ہوتے ہیں نہایت شریف اور مسکین بن کر آپ کے پیچھے چلتے رہتے ہیں اور اچانک موقع پا کر حملہ کر دیتے ہیں۔ کئی بالکل قدامت پرست ہوتے ہیں آپ انھیں لاکھ نئے نئے رستے سمجھائیں وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے اور پھر وہیں آموجود ہوتے ہیں جہاں سے چلے تھے چھوٹی چھوٹی دشمنیوں چھوٹی چھوٹی دوستیوں اور چھوٹی چھوٹی بے نیازیوں نے اپنی چند روزہ زندگی گزار دیتے ہیں"

(انتخاب پیاز کے چھلکے ص[۷۶])

اس طرح فکر نے سماجی زندگی اور انسان کی حالت زار پر روشنی ڈالی ہے۔

فکر تونسوی زندگی کے ہر واقعہ پر ہر چیز پر گہری نظر رکھتے ہیں ان کے طنز کے موضوعات میں زندگی کا ہر گوشہ اور زندگی کی ہر بات شامل ہوا کرتی ہے۔ فکر کے طنز و مزاح کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ وہ پیش پیش افتادہ باتوں سے بڑے اہم اخلاقی نتائج برآمد کرتے ہیں۔ طنز نگار ایک واعظ اور ناصح کا بھی کام انجام دیتا ہے۔ لیکن واعظ اور طنز نگار کے کاموں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ واعظ تو کسی چیز پر آمادہ کرتا ہے لیکن طنز نگار چیزوں کی خرابیوں کی طرف اشارہ کر کے خاموش رہ جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ہم کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ ہم کمزوریوں اور مذمت کے سلسلے میں اس کے ہم زبان ہو جائیں۔ آر تھر پولارڈ اسی وجہ سے لکھتا ہے۔

"طنز نگار کا موقف ناصح سے زیادہ نازک اور مشکل بھی

ہوتا ہے چونکہ ناصح کسی اچھائی کو یا نیکی کو قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن طنز نگار اپنے قاری کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ دوسرے آدمیوں میں جو کمزوری ہوتی ہے اس کی مذمت کرے۔"

("سٹائر" از آرتھر پولارڈ ص۱)

اس مذمت میں بعض وقت چھوٹے بڑے سب ہی لوگ شامل ہو جاتے ہیں قاری یہہ بھی محسوس کرتا ہے کہ کہیں طنز نگار کے مذمت میں ساتھ دینے سے اس کا یہہ ساتھ مہنگا نہ پڑ جائے۔ کیونکہ طنز نگار کا نشانہ صرف معمولی اور غیر اہم ہی آدمی نہیں ہوا کرتے بلکہ بڑے بڑے اقتدار کے اور اونچے اونچے منصب پر فائز شخصیتیں بھی ہیں جیسے کہ فکر اپنی مذمت کے دوران میں بڑی شخصیتوں یعنی وزیروں کو بھی نہیں چھوڑتے۔ وہ ایک جگہ مختلف وزیروں کے بارے میں لکھتے ہوئے سبھی پر کچھ نہ کچھ طنز کر گئے ہیں۔ یہہ وہ زمانہ تھا جبکہ مرارجی دیسائی، لال بہادر شاستری اور جگجیون رام مختلف وزارتوں کے قلم دان سنبھالے ہوئے تھے۔ فکر ان سب کے بارے میں اپنے [illegible] میں لکھتے ہیں۔

"یہی حالت شری مرارجی دیسائی کی ہے۔ ان میں کرشن مراری والی کوئی بات نہیں ہے مثلاً اگر ان کے منہ پر بانسری رکھ دی جائے تو ساری سکھیاں ڈر کر بھاگ جائیں اور پھر ہمارے لال بہادر شاستری ہیں (یا شاستری تو واقعی ہیں کیونکہ کئی شاستر پڑھ چکے ہیں) انھیں

دیکھ کر کسی ننھے بالموا کا تصور آسکتا ہے مگر یہ خیال نہیں
آتا کہ شاستری جی نیپال کے جنگلوں میں جا کر شیر کا شکار
کر ڈالیں گے شری جگ جیون رام کے بارے میں کہا
گیا تھا کہ وہ سارے جگ کے جیون آدھار ہیں لیکن
ان میں نقص یہ ہے کہ وہ برابر ریل بھاڑا بڑھاتے جاتے
ہیں اور سارا جگ پریشان ہے کہ جیون کی ریل پر کیسے چڑھیں
اس اعتبار سے ان کا نام "بھاڑا بڑھوان رام ہونا
چاہیے تھا۔"

(انتخاب پیاز کے چھلکے ص ۹۶)

یوں فکر تونسوی کا قلم ہر ایک کے بارے میں بڑی بے باکی سے چلتا ہے اور وہ اپنے طنز و مزاح کا حربہ بے دریغ اور بڑی جرارت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ فکر اپنی گہری بصارت سے کام لے کر چھوٹی چھوٹی باتوں سے جس طرح بڑے نتائج اخذ کرتے ہیں اور انسان جس طرح سے ناانصافیوں کا شکار ہوتا ہے اس کا ذکر بعض وقت پردے ہی پردے میں بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔ وہ امیروں اور غریبوں میں، امیروں کو جو ہر طرح سے سہولتیں حاصل ہیں اور غریب جس حالت میں رہتے ہیں اس اس کی طرف "جوتے" کا ذکر کرتے ہوئے امیروں کی امارت پر طنز کرتے ہیں۔

"جوتے ایک اور مذاق بھی کرتے ہیں یعنی غریب لوگ
انھیں بناتے ہیں اور امیر لوگ انہیں پہنتے ہیں۔ امیر

لوگ جب انھیں اتار کر پھینک دیتے ہیں تو غریب لوگ انہیں پہن لیتے ہیں۔ انسان نے جب جوتا ایجاد کیا تھا تو وہ اس قسم کے مذاق کا آدمی نہیں تھا۔"

(انتخاب پیاز کے چھلکے صـ۵۳)

فکر کی طنز نگاری کے یہ اتنے کم اور قلیل نمونے ہیں کہ اس سے ان کے طنز کی وسعت کا اور ہمہ گیری کا اندازہ لگا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ ایک ایسا طنز نگار جو اب تک ہزاروں کالم، ہزاروں عنوانات سے لکھ چکا ہو اس کی طنز نگاری کو چند ایک نمونوں سے ظاہر کرنا نہ اس کے طنز کے ساتھ انصاف کرنا ہے اور نہ ہی اس کے طنز کی نمائندگی ممکن ہے۔ فکر اب تک پانچ ہزار کالم لکھ چکے ہیں اور ان کالموں میں ہندوستان کی زندگی کا ہر رخ ہندوستانی سماج کی کمزوریاں، ہندوستان کی سیاسی زندگی کے پیچ وخم اور ان کی کوتاہیاں، سماجی زندگی کا ہر رخ اور اس کی برائیاں معاشی زندگی کے نشیب وفراز اور اس کی نابرابریاں، مذہبی زندگی اور اس کی روایت پرستیاں، ادبی زندگی اور ادبی دنیا کی بے ادبیاں غرض یہ کہ کون سا ایسا ایسا موضوع ہے جہاں فکر کے قلم نے اپنے نوک قلم سے نشتر زنی نہیں کی ہے۔ فکر نکر رسا انسان ہندوستان اور ہندوستانی زندگی، انسان، اور انسانیت کے گمبھیر مسائل کو نہ صرف ان کی ساری گمبھیرتا کے ساتھ پیش کرتی ہے بلکہ ان کے حل اور ان کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت کو بھی واضح کرتی ہے۔

فکر کا قلم جس تیزی سے، جس تیز رفتاری سے اور جس انہماک سے پچیس سال سے چل رہا ہے وہ خود اس بات کا محکم ترین ثبوت ہے کہ فکر انسانی

انسانی مسائل سے کتنی دلچسپی رکھتے ہیں اور انسانی خدمت کا کیسا شدید اور پاکیزہ جذبہ ان کے اندر کام کر رہا ہے۔ ان بیس سالوں میں جو ہزاروں صفحات لکھے ہیں ان کی ایک اہم اور امتیازی خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ ان کے طنز میں معیار کی یکسانیت ملتی ہے۔ اردو کے مشہور و مقبول افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی نے راقم الحروف کو بمبئی میں ایک ملاقات کے دوران بتایا کہ۔

فکر کے طنز و مزاح میں جو معیار کی یکسانیت ملتی ہے وہ
حیرت ناک بات ہے اور یہ ہر اہل قلم کے بس کی بات نہیں
ہے کہ وہ یوں مسلسل لکھتے ہوئے اپنے معیار کو اس خوبی سے نبھا سکے۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ فکر کی کالم نگاری اتنی وسعت رکھتی ہے اور اس میں اتنا تنوع ہے کہ خود ان کے لیے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت ہے جیسا کہ اوپر ظاہر کیا گیا ہے کہ فکر نے ابتک کوئی چھ ہزار کالم اپنے قلم کی سیاہی سے منور کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی لکھی گئی ہے کہ ان کے طنز و مزاح کے کالم "پیاز کے چھلکے" کا صرف ایک ہی انتخاب چھپا ہے۔ فکر اگر اپنے ان کالموں کو کتابی صورت دیتے تو ایسے انتخاب کی کوئی دو سو کتابیں صرف کالموں کے انتخاب ہی کی اردو طنز و مزاح میں اضافہ کا باعث ہوتیں۔ لیکن فکر صرف لکھنا ہی جانتے ہیں اپنی کوئی چیز چھپانے یا طبع کروانے کے لیے حرکت میں نہیں آتے۔ اس بات سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ "خود پسندی" کی خو نہیں رکھتے۔ غرض کہ یہ بات ان کی کالم نگاری اور ان کی طنز نگاری پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے کہ ؎

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے۔

●●

انشائیہ نگاری

"انشائیہ" ادب کی بڑی ہی لچک دار صنف ہے یہاں انشائیہ سے مراد انگریزی صنف "ایس سے" سے ہے۔ ایس سے انگریزی میں بے حد معروف و مقبول صنف ادب ہے، انشائیہ اصل میں انگریزی صنف ایس سے ہی کا ترجمہ ہے۔ خاص طور پر انشائیہ سے مراد "پرسنل ایس سے" ہوا کرتا ہے۔ یہہ صنف ادب اپنے اندر بڑی وسعتیں رکھتی ہے۔ اس میں ہر موضوع پر اظہار خیال کیا جاسکتا ہے۔ ایس سے کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہوا کرتی ہے کہ اس میں ذہن کی رو کو بڑی عمدگی سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں شخصی تاثرات دلی جذبات ذہن و فکر کی جولانیاں، احساسات کی بو قلمونی، غرض مختلف شخصی ارتسامات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ پھر یہ کہ اس میں کسی خاص تسلسل ربط کی پابندی بھی ضروری نہیں ہوا کرتی بلکہ ذہن کی رو شخصی احساسات جو بھی راہ سجھاتے ہیں، انشائیہ نگار کا قلم اس راہ پر چلنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ کی وسعت اور لچک سے جتنا طنز و مزاح نگاروں نے فائدہ اٹھایا ہے کوئی دوسری

صنف کا اہل قلم شاید ہی اس سے اتنا فائدہ اٹھایا ہو۔

اردو میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انشائیہ نگار حقیقی معنوں میں صرف طنز و مزاح نگار رہی ہیں کیونکہ سنجیدہ لکھنے والوں میں کم از کم اردو ادب میں اس صنف ادب کی طرف جیسی کہ چاہیے توجہ نہیں کی یا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ سنجیدہ لکھنے والوں کے لیے دوسری اصناف ادب نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا۔ طنز و مزاح نگاروں کیلیے یہ صنف بھی بڑی ساز گار ثابت ہوی کہ اس میں بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی "غزل کا سا انداز ملتا ہے" اشاروں، کنایوں میں اس میں بہت کچھ کہہ دیا جا سکتا ہے" چیدہ خیالی" کی بڑی گنجائش رہتی ہے۔ موضوع سے نہ ہٹتے ہوے موضوع سے ہٹنے کی پوری پوری گنجائش رہتی ہے۔ یہاں اس سے مراد یہ بتانا مقصود ہے کہ انشائیہ نگار کسی خاص موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس موضوع سے متعلق جتنی باتیں بھی ذہن میں آتی ہیں جو جو تاثرات سامنے آتے ہیں ان سب کو وہ احاطہ تحریر میں لے آتا ہے۔ تنکے کا ذکر کرتے ہوئے خس و خاشاک کا بیان خس و خاشاک کے بیان سے جنگل و بیابان کا ذکر جنگل کی آگ کے تذکرہ سے پہاڑ کی آگ کا بیان اور پہاڑ کی آگ سے کوہ طور کی طرف توجہ اور کوہ طور کے بیان سے تجلی خداوند عالم اور اس طرح یہ لن ترانی تنکے سے شروع ہو کر خدا تک پہنچ سکتی ہے۔ یہ بے ربطی بالکل ویسی ہی ہوتی ہے جو غزل میں ملتی ہے۔ لیکن جس طرح ان بے ربطیوں میں ربط پیدا کرنے کی قدرت رکھتی ہے اس طرح انشائیہ میں بھی بظاہر غیر متعلق باتوں میں گہرا ربط دکھانا انشائیہ نگار کی فن کاری پر منحصر ہوتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے طنز و مزاح نگاروں نے اس صنف انشائیہ سے خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے اور اس کو ایک نیا رنگ اور نیا روپ وہ بھی ایسا رنگ روپ جو سب کو اپنی طرف متوجہ کرے بخشا ہے ۔ فکر بھی دوسرے طنز و مزاح نگاروں کی طرح خاص طور پر ایسے طنز و مزاح نگار جو نثر میں اظہار خیال کرتے ہیں اس صنف ادب سے بے انتہا کام لیا ہے ۔ سچ پوچھیے تو ان کی کالم نگاری ہو یا ناول نگاری ان سب میں اس صنف کی جلوہ آرائیاں ہیں ۔ اس طرح فکر کو بنیادی طور پر انشائیہ نگار کہا جا سکتا ہے ۔

فکر کے مختلف انشائیے اب تک کئی کتابوں کی شکل میں آ چکے ہیں جیسے ان کی حالیہ کتاب "بدنام کتاب" بھی اسی صنف ادب کی آماجگاہ ہے ۔ "وارنٹ گرفتاری" "ساتواں شاستر" "چاند اور گدھا" "ہم ہندوستانی" بیس ہزار چراغ" "تیر نیم کش" اور "خدوخال" ہیں ۔ خدوخال اگرچہ مختلف شخصیتوں کے خاکے ہیں لیکن مرقع نگاری اور خاکہ نگاری بھی انشائیہ نگاری سے الگ نہیں ہوتی بلکہ انشائیہ نگاری ہی کی ایک صورت خاکہ نگاری ہوتی ہے جب کسی خاص شخص سے حاصل ہونے والے شخصی تاثرات و احساسات کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو وہ خاکہ یا مرقع بن جاتا ہے ۔ ورنہ انشائیہ نگاری اور خاکہ نگاری میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے بلکہ انشائیہ نگاری ہی کی ایک خاص صورت کو یہ نام دے دیا جاتا ہے ۔

خدوخال میں کوئی تیرہ ۱۳ خاکے جمع ہیں لیکن یہ سب فکر کے لکھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان میں آٹھ (۸) خاکے صرف فکر نے لکھے ہیں اور باقی خاکے دوسروں نے لکھے ہیں ۔ کرشن چندر نے کنہیالال کپور پر "جھریا" کے نام سے خاکہ لکھا ہے ۔

کوشلیا اشک نے "طوطا" کہہ کر اوپندر ناتھ اشک کا خاکہ اڑایا ہے۔ بلونت سنگھ
راجندر سنگھ بیدی کو "چلبلا" بتاتے ہیں۔ بلراج کومل کے نزدیک پرکاش پنڈت
"بورژوا" ہیں اور ذکی انور کے نزدیک سہیل عظیم آبادی "بھیا" ہیں فکر باری کو
"دیوتا" ثابت کرنا چاہتے ہیں اور فکر کے نزدیک احمد ندیم قاسمی "پیرزادہ" ہیں
کنہیا لال کپور کو فکر "مسخرا" کہہ کر چڑاتے ہیں۔ بلونت سنگھ کو "جگا" یعنی جگا ڈاکو
سے مناسبت پیدا کر کے ان کے سردار ہونے پر طنز کرتے ہیں۔ مخمور جالندھری
کو فکر ان کے نام کی مناسبت سے "متوالا" ہی کہہ کر پکارنا ضروری سمجھتے ہیں
اور ساحر لدھیانوی کو ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر ہم غریبوں کا
اڑایا ہے مذاق کے عین مطابق "شہزادہ" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ تاجور سامری
کو فکر ان کی فطرت کے خاص پہلو کے پیش نظر "لڑیا" کہنا مناسب سمجھتے ہیں۔
اور فکر کے پاس عبد المتین عارف ابھی "بچہ" ہیں۔ اس طرح یہ خاکے فکر کے
طنز و مزاح کو ظاہر کرتے ہیں اور ان کی انشائیہ نگاری کا یہ رخ بھی بڑا دلچسپ
اور قابل مطالعہ ہے۔

"وارنٹ گرفتاری" فکر کے انشائیوں کا ایک اہم اور نمائندہ مضامین
کا مجموعہ ہے۔ گو فکر نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ طنزیہ کہانیاں ہماری
روزمرہ کی مضحکہ خیزیوں کے آئینے ہیں جن میں ہم اپنی شکل دیکھ کر منہ بھی بنائیں گے
"فکر نے جو باتیں اپنے طنز کے بارے میں کہی ہیں انھوں نے وارنٹ گرفتاری
کو طنزیہ کہانیاں اپنے طنز کے بارے میں کہی ہیں انھوں نے وارنٹ گرفتاری
کو طنزیہ کہانیاں لکھا ہے۔ حالانکہ ان کو کہانیاں کہنا صرف کہانیوں کو
تہمت لگانا ہے۔ اس میں کہانی پن تو کہیں کہیں ہے لیکن وہ دراصل انشائیے ہی

ہیں یہ کس قسم کی طنزیہ کہانیاں ہو سکتی ہیں اس کا اندازہ ان کے ایک انشائیے "فارم مردم شماری" سے لگایا جا سکتا ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں۔

"پیدائش کے وقت ہندو تھا جوانی میں اسلام کی طرف رجوع ہوا سکھ دوستوں سے مراسم گہرے ہوئے تو سکھ دھرم پر کشش محسوس ہوا۔ کسی نے بتایا یہ تو ہندو دھرم ہی کی ایک شاخ ہے چنانچہ اسے بھی ترک کر دیا کچھ دیر مذہب انسانیت کو اپنایا لیکن ایک بار اس مذہب کا ایک شدھ ہوٹل میں چمچہ چراتے ہوئے پکڑا گیا تو میں نے چمچہ کی رقم ادا کر دی اس مذہب سے بھی پیچھا چھڑا لیا آج کل لامذہب ہوں میری طرح میری ایک مرغی بھی لامذہب ہے کیونکہ وہ ہندو سکھ مسلم عیسائی جن کے یہاں بھی پہنچ جائے گی اسی کے گھر میں انڈا دے گی۔ میرے بچے مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں والد صاحب ہمیں بتایئے ہم کونسے مذہب والے ہیں اور میں انھیں کہا کرتا ہوں "مذہب عشق کے"۔

(وارنٹ گرفتاری از فکر تونسوی سنہ ۶۷ء صفحہ ۸۹)

فکر کی یہ تحریر خواہ اسے کچھ بھی کہہ لیجئے اپنے طنز کی وجہ سے اہمیت اختیار کرتی ہے۔ فکر نے یہاں سب ہی مذاہب پر طنز کیا ہے اور حد یہ کہ جو لوگ اپنا مذہب "انسانیت" بتاتے ہیں ان پر تو فکر کا طنز اور گہرا ہو گیا ہے۔ فکر نے یہاں انسانیت سے مرغی کا تقابل کر کے انسان پر بہت بہت گہرا اور شدید طنز کیا ہے لیکن مرغی کی جو فطرت ہے وہ انڈے دینا ہے۔ وہ ہر جگہ ہر حال میں ہر ایک کے پاس انڈا دے گی۔ وہ انڈا

دیئے بغیر رہ بھی نہیں سکتی لیکن انسان جس کو اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ بھی ہے وہی پہلے ہندو سکھ عیسائی یا مسلمان ہوتا ہے اور بعد میں انسان حالانکہ انسان کی فطرت تو انسانیت ہونی چاہیئے تھی ۔ اور یہہ انسانیت کا ظہور ہر جگہ ہونا چاہیئے تھا ۔ ہر حال میں ہونا چاہیئے تھا ہر مذہب میں ہونا چاہیے تھا لیکن انسان مرغی سے گیا گزرا ہے اور اس کی انسانیت مرغی کے انڈے سے بھی بدتر ہے ۔ کیونکہ ہر جگہ یہہ تو گندا ہو سکتا ہے ۔ اور ہو جاتا ہے لیکن انسان کی انسانیت کو یہہ توفیق بھی حاصل نہیں ہے ۔ اس لیئے فکر ہر ایک مذہب پر طنز کرتے ہوئے "مذہب عشق کو" اپنا لینا چاہتے ہیں۔

فکر اپنے طنزیہ انشائیوں کے ذریعہ سماج اور انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اس لیئے وہ ہر اس بات پر طنز کرتے ہیں جو زندگی میں کسی بھی ناانصافی کو روا رکھتی ہے ۔ فکر کی زندگی صرف اس مقصد کے حصول کے لیے گویا وقف ہو چکی ہے ۔ سنہ ۱۹۴۷ء ان کی زندگی کا ایک بے حد اہم موڑ ثابت ہوا ہے ۔ فکر کی انفرادیت یہ ہے کہ زندگی کے تلخ حالات اور تجربات میں ان کے طنز کو" زہرناک" نہیں بنایا ۔ ان کے طنز کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ " فکرناک "ہے ۔ اس لیے کہ یہ پڑھنے والوں کو دعوت فکر دیتی ہے ۔ ان کی فکر کو مہمیز لگاتی ہے ۔ ان کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے ۔ فکر اپنے طنز کی "فکرناکی" کی وجہ سے صرف " زہرناکی" ہی سے محفوظ نہیں رہے بلکہ اس کی وجہ سے ان کے طنز میں مزاح بھی ابھرتا ہے ۔ طنز کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ بغیر مزاح کے طنز گالی بن جاتا ہے"۔ فکر اس بات کو شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ پاٹس کے کہنے کے مطابق "جب

کوئی طنز نگار مزاح پر زیادہ توجہ دیتا ہے تو اس کی فکر زیادہ بالغ اور اس کا فن سچائی پر زیادہ مبنی ہوتا ہے۔" یہ بات فکر پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے۔ فکر اپنے طنز میں اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔ انھوں نے راقم الحروف کے نام اپنے ایک خط میں اپنی طنز نگاری کی طرف توجہ اور اس کے ذریعہ جو وہ ہندوستان اور انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اس کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تقسیم ہند کے جھٹکے نے ایک ذہنی صدمہ پہنچایا اس صدمہ میں درد و کرب، غصہ اور کچھ کرنے کا جوشیلا جذبہ بھی شامل تھا۔ سماج کی جو طاقتیں عوام کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر ان کا ذہنی سماجی اقتصادی اور مذہبی استحصال کر رہی تھی ان کو ننگا کرنے کے لیے انھیں مضحکہ خیز ثابت کرنے کے لیے اور عوام تک ایک صحت مند شعور اور انقلابی امنگیں پیدا کرنے کے لیے میں نے طنز کے ہتھیار کو بے حد ضروری پایا اور مفید بھی کہ اس سے عوام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی پیدا ہو جاتی تھی اور مسکراہٹ کے ساتھ ایک درد و کرب کا احساس بھی جنم لے لیتا تھا۔"

فکر دوسروں میں درد و کرب کا احساس پیدا کرنے سے پہلے خود سب سے پہلے اس درد و کرب سے گزرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی آسانی سے متاثر کر لیتے ہیں ہندوستان کے لیے ان کا دل تڑپتا ہے اور

وہ اس کی کمزوریوں کو طنز و مزاح کا نشانہ بناتے ہیں۔ لیکن یہ طنز۔ نفرت کا نتیجہ نہیں ہے۔ بیزارگی کی وجہ سے نہیں ہے۔ غصہ کی وجہ سے نہیں ہے جیسا کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کہا کہ۔

"طنز میں جوش رنج، غصہ اور بیزاری کی کارفرمائی ہوتی ہے۔" ص۲۴۰

(علی گڑھ میگزین مارچ ۱۹۵۸ء رشید احمد صدیقی)

اس کے برخلاف طنز ہمدردی اور محبت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ فکر کے طنز کی یہ خصوصیت اس وقت خاص طور پر ظاہر ہوتی ہے جب وہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کا ذکر کرتے ہیں وہ ہندوستان کی کمزوریوں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں لیکن اس طنز میں بھی ان کی اپنے وطن سے محبت اور لگاؤ صاف طور پر نمایاں ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"آپ ہندوستان کو بھی نہیں جانتے اتنی بڑی سنسکرتی کا ملک اور آپ پوچھتے ہیں کہ ہندوستان کیا ہے سخت افسوس آتا ہے، آپ کی نامکمل معلومات پر۔ ارے صاحب ہندوستان وہ ہے جہاں کمبھ کا میلہ لگتا ہے جہاں پیپل کی پوجا ہوتی ہے جہاں گائے اور مسجد پر فساد ہوتے ہیں۔"

(وارنٹ گرفتاری ص۹)

فکر اپنے طنز کے ذریعے جیسا کہ کہا جا چکا ہے بنی نوع انسان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے حالات لکھتے ہوئے اور ان کو اپنے مزاح کا نشانہ بناتے ہوئے بھی یہی خدمت انجام دیتے ہیں۔ ایک جگہ انھوں نے اپنی حقیقی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے۔

"مرحوم نے رنگریزی کے بعد کئی پیشے اپنائے رنگ آمیزی
کمپوزیٹری، کلرکی، اسکول ماسٹری، پینٹری، دوکان داری
چپراسی گیری، طباعت اور جب کہیں کامیاب نہ ہوسکے
تو والدین نے تنگ آکر ان کی شادی کردی ... بہر کیف
انھوں نے زندگی بھر بنی نوع انسان کی خاطر کام کیا۔ مثلاً
نظموں کی ایک کتاب قلمبند کی مگر اس میں بہبودی آدم
کچھ زیادہ گہری ہو گئی کہ کسی آدم کی سمجھ میں نہ آسکی۔ ادیبوں
کی انجمنیں قائم کیں جو آپس میں لڑ جھگڑ کر ختم ہو گئیں۔ دو
ہفتہ وار اخبارات اور چار ادبی ماہنامے جاری کیے"

(وارنٹ گرفتاری ص ۱۷۶)

فکر اپنے طنز میں بہبودی آدم کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس کو بھی طنزیہ رنگ میں پیش کر کے یہ چاہتے ہیں کہ "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی" لیکن فکر کے اس جنون کی حالت سے یہ بات صاف طور پر مترشح ہو جاتی ہے کہ وہ کس درجہ انسانیت کی خدمت کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں۔ کسی بھی طنز نگار کا طنز اس وقت تک گوارا نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کے طنز کے پیچھے شخصیت کا خلوص نہ کام کرے۔ کیونکہ خلوص ہی ہر فن اور ہر صنف ادب میں سب سے اہم اور سب سے بڑا مقام رکھتا ہے۔ اسی کی وجہ سے فن اور ادب میں وقار بھی آتا ہے اور اعتبار بھی پیدا ہوتا ہے اور خلوص بغیر ہمدردی کے بغیر لگاؤ کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ فکر کے پاس یہی ہمدردی کا جذبہ ہے جو اُن کے طنز میں پوری طرح کام کرتا ہے اور یہی خلوص و ہمدردی کی وجہ سے فکر کے

قلم کی روشنائی اب تک بھی نہیں سوکھی ہے۔ فکر کا یہ دردِ دل ہی ہے جو ان کے خامے کو خونچکاں بنائے ہوتے ہے اور ان کی انگلیاں اگرچہ کہ قلم پکڑے پکڑے فگار ہو گئی ہیں اور نوکِ قلم سے خون رِس رِس کے ان کی تحریر کو زندگی کو بخش رہا ہے اور اس وجہ سے ان کا قلم مسلسل اور لگاتار چل رہا ہے اگر فکر کا دردِ دل کم ہو جاتا یا اس کا اظہار مکمل ہو جاتا تو وہ کب کا مفلوج ہو کر رہ جاتا یا بیکن معجزہ فن کی نمود خونِ جگر سے ہوتی ہے یا پھر دردِ دل سے اور یہ دونوں باتیں فکر کے طنز و مزاح میں صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ اور ان ہی کی وجہ سے فکر کی زرخیزی بھی قائم ہے اور وہ اپنی "زنبیلِ فکر" سے ملک اور انسانیت کی چارہ گری کرنا چاہتے ہیں اور اس چارہ گری کے لیے "نسخہ کیمیا طنز و مزاح کا استعمال کرتے ہیں۔

وارنٹ گرفتاری کے علاوہ جن میں فکر کی انشائیہ نگاری کو جوہری دھماکے "ملتے ہیں ان میں چوراہے پہ گوری، بیس ہزار چراغ، ساتواں شاستر چاند اور گدھا، ہم ہندوستانی، اور تیر نیم کش خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان کتابوں کے بعد فکر کی سب سے تازہ ترین کتاب "بدنام کتاب" گل سر سبز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ فکر کی پختگی اور طرفگی کا شاہکار ہے۔ یہاں فکر کا طنز و مزاح بھی شباب پر نظر آتا ہے۔ اور وہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نقطۂ کمال پر پہنچ گیا ہے۔ بدنام کتاب کے بارے میں اردو کی چوٹی کے افسانہ نگار کرشن چندر جو خود بھی طنز و مزاح میں ایک بلند اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ فکر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"فکر تونسوی اردو ادب میں طنز و مزاح کے عظیم فن کار

ہیں۔ ان کے طنزیہ مضامین اور مزاحیہ خاکے نہ صرف انسانی فطرت کی بوالعجبیوں کی آئینہ داری کرتے ہیں، بلکہ عصر حاضر کے سماجی مسائل اور ان سیاسی اور اقتصادی طاقتوں کی گہری سوجھ بوجھ کا اظہار کرتے ہیں جو ہمارے سماج میں تباہی اور پستی کی ذمہ دار ہیں فکر تونسوی آپ کو محض ہنسانے کے لیے نہیں ہنساتا بلکہ وہ اپنے گہرے تجربے سے آپ کو مجبور کرتا ہے۔ آپ بیٹھ کر سوچیں اور اپنے گرد ونواح کی دنیا پر نظر ڈالیں وہ ایک ایسے مزاح نگار ہیں جو سماجی مسائل کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ اور ہمارے زمانے کی پیچیدگیوں کا شعلہ بار تجزیہ کرنے میں مشہور ہیں۔"

(وارنٹ گرفتاری پر رائے، کرشن چندر ابتدائی صفحات

کرشن چندر کی یہ رائے اس لیے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ انھوں نے بڑی عمدگی سے فکر کی خدمات اور ان کے طنز کے خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک بڑے فن کار کا خراج عقیدت دوسرے بڑے فن کار کے لیے ہے۔ کرشن چندر نے بے حد اختصار سے اور بڑے جامع انداز میں فکر کے دریائے طنز و مزاح کو "کوزہ" میں بند کرنے کی حد درجہ کامیاب اور بارآور کوشش کی ہے۔ فکر کی رعنائی فکر اب سب ہی سے خراج تحسین حاصل کرنے لگی ہے۔ گو بہت دیر سے اور بڑی دیر کے بعد فکر کے فن پر اور ان کی شخصیت پر اب فکر کی جارہی ہے۔ لیکن یہ بھی غنیمت ہے کہ فکر نے جو کچھ

کیا ہے اور جتنا کچھ دیا ہے وہ اپنی کیفیت و کمیت کے اعتبار سے اس قدر وقیع ہے کہ اس پر دفتر کے دفتر لکھے جائیں۔ لیکن اب جو فکر کے تعلق سے ادیبوں اور دانشوروں کی فکر مبذول ہوئی ہے اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ آئندہ فکر پر بہت کچھ کام ہوگا۔ فکر اب ہر مکتبۂ خیال ہر اہم ادیب کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ راقم الحروف کو چند ایک اُردو کی مایہ ناز ہستیوں سے ملنے اور فکر کے بارے میں ان کی رائے معلوم کرنے کا موقع حاصل ہوا۔ یہ سب شخصیتیں فکر کے طنز و مزاح کو سراہتی اور اس کی اہمیت کو تسلیم کرتی نظر آئیں۔ اردو کی بے باک جری اور مایہ ناز افسانہ نگار عصمت چغتائی کی رائے بھی راقم الحروف نے معلوم کی۔ عصمت چغتائی فکر کو اردو کا بہت بڑا طنز نگار مانتی ہیں۔ اور فکر کے طنز کی سچائی اور اس کے تیکھے پن کا خاص طور پر ذکر کرتی ہیں۔ اُردو کی دوسری مشہور افسانہ نگار جن کو اردو کے مایہ ناز اور باکمال طنز و مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی کی دختر نیک اختر ہونے کا شرف حاصل ہے اور جنہیں اُردو کے بہت بڑے افسانہ نگار کرشن چندر کی بیوی ہونے کا فخر حاصل ہے راقم کی مراد ہے سلمیٰ صدیقی وہ بھی فکر کے طنز کے بارے میں راقم الحروف کو واقف کروائیں کہ فکر کا موجودہ طنز نگاروں میں بہت بڑا درجہ اور مرتبہ ہے۔ اور یہ کہ فکر کو جو انفرادیت حاصل ہے وہ کسی اور طنز نگار یا مزاح نگار کو حاصل نہیں ہے۔ وہ یہ کہ فکر پچیس سال سے مسلسل روزانہ طنز و مزاح کے ذخیرہ میں اضافہ کر رہے ہیں۔ یہ وہ کمال ہے جو ان کے سوا کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا ہے۔ اس طرح ہر مکتب خیال کے ادیبوں سے فکر "مزاج طنز و مزاح" وصول

کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پروفیسر جامعہ ملیہ و صدر شعبہ اُردو فکر کے طنز و مزاح کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"فکر تونسوی ان گنے چنے ادیبوں میں سے ہیں جنھیں قدرت کی طرف سے طنز و ظرافت کا درد اور ادراک عطا کیا جاتا ہے وہ گذشتہ تین دھائیوں سے لطیف مزاحیہ رو میں لکھ رہے ہیں۔ اور اردو طنز و مزاح کی دنیا میں خاص مقام پیدا کر لیا ہے ...... ان کی بدنام کتاب آج کی سماجی اور سیاسی زندگی پر مسلسل قہقہہ اور طنز ہے جس سے ہمارے سماجی اور سیاسی خداؤں کو کچھ سوچنے پر مجبور ہونا چاہیے۔"

آگے چل کر ڈاکٹر گوپی چند اُردو کے دوسرے طنز و مزاح نگاروں میں فکر کی جو انفرادیت ہے اور ان کا الگ اور ممتاز مقام ہے۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"فکر تونسوی نے شوکت تھانوی اور عبد المجید سالک کی خوش گوار روایات کو ایک نئی تحدید عنایت کی ہے ان کا طنز و مزاح پطرس کی طرح نہ دانشوروں کے لیے ہے اور نہ رشید احمد صدیقی کی طرح صرف رئیسوں کے لیے ہے بلکہ ان کا اسلوب منفرد ہے وہ زمین پر بھی رہتے ہیں ان کے لیے آسمان پر پرواز کرنے کی بجائے زمین پر سیدھا چلنا زیادہ اہم ہے۔ آپ کا مزاح عام انسانوں کے لیے

راست سیدھا، توانا اور بے باک ہے۔ ان کی زبان منفرد اور اکھیری ہے تیز تیکھی موثر اور بعض اوقات تلخ لیکن ان کی زبان زیادہ تر قہقہہ اور شگفتگی سے بھرپور ہے۔"

(وارنٹ گرفتاری پر رائے گوپی چند نارنگ ابتدائی صفحات)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے فکر کو "دھرتی کا باسی" کا بڑا فکرانگیز لقب دیا ہے۔ فکر حقیقت میں اپنے دھرتی کے باس ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ دھرتی کے ہر زخم کو ہر ناسور کو اپنے طنز و مزاح کے نشتروں سے چیر کر پاک اور صاف کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور آرزو بھی رکھتے ہیں۔ فکر کے طنز و مزاح کی اس نشتریت میں جو "سفاک مسیحا چھپا بیٹھا ہے ان کی طرف مرحوم ناول نگار، زندہ فلم ساز اور کہانی نویس، راما نند ساگر اپنے فلمی ادب کے ساگر سے سر ابھار کر فکر کی باتوں کو اور ان کے طنز و مزاح کو سن کر بول اٹھتے ہیں۔

"اس کے نشتر میں کتنا ہی زہر ہو مگر وہ نشتر لگاتا ہے تو زبان سے آہ نہیں واہ نکلتی ہے۔ یہ ہے فکر کے فن کا جادو، فکر تونسوی کے دل میں سماج کا درد ہے اس لیے جب وہ چرکے لگاتا ہے تو قاتل کے خنجر سے نہیں، ایک ڈاکٹر کے نشتر سے چنانچہ جس طرح مریض جراحی کے باوجود اپنے ڈاکٹر کے احسانمند ہوتا ہے۔ اس طرح ہمارا سماج بھی اس ادبی جراح کا ہمیشہ احسان مند رہیگا۔ اور فکر کے لیے دعا بھی کچھ ایسی ہی کرنے کو چاہتا ہے۔

(وارنٹ گرفتاری برائے راماننداساگر آخری صفحہ)

ع   نشتر کا تو ہے زہر بڑھے اور زیادہ

یہ بات پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ فکر کا طنز و مزاح ہر قسم کے لوگوں سے خراج تحسین حاصل کر رہا ہے اپنے اپنے طور پر ہر ایک فکر کے، طنز و مزاح کو اپنے اپنے منفرد انداز سے سراہتا بھی ہے اور اس کی بڑائی کا اعتراف بھی کرتا ہے۔ اُردو ظرافت کا حیدرآبادی شہزادہ مجتبیٰ حسین بھی اپنے سخت قسم کے ظریفانہ رنگ فکر سے اپنی عقیدت کا اعتراف کرتا ہے اور فکر کی "بارگاہِ فکر" میں نذرانہ ظرافت کے پھول چڑھاتا ہے۔ اپنے کالے کلوٹے ہونٹوں سے مزاح کے شگفتہ پھول برساتے ہوئے یوں گویا ہوتا ہے۔

"دس بارہ سال پہلے میں ملاپ میں فکر تونسوی کا کالم پیاز کے چھلکے کچھ ایسی پابندی سے پڑھا کرتا تھا جیسے کوئی بھگت پابندی سے گیتا کا پاٹھ کرتا ہے محض پیاز کے چھلکے کی خاطر ملاپ کی سالم کاپی یوں خریدا کرتا تھا جیسے کسی دوشیزہ کے گال پر خوشنما سیاہ تل دیکھ کر بعض ناعاقبت اندیش نوجوان سالم دوشیزہ سے شادی کر لیتے ہیں۔ فکر تونسوی آج بھی میرے لئے ادب کے گال پر سیاہ تل کی حیثیت رکھتے ہیں۔۔۔۔ ادیب کی حیثیت سے میں انھیں اس لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ ہمیشہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر مضامین لکھتے ہیں ادب میں آج تک کسی نے اس طرح مضامین لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر ہر گواہ یہ کہتا ہے کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو کچھ بھی کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوائے کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ اس طرح فکر تونسوی اپنا ہر مضمون لکھنے کے پہلے خود اپنے آپ کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا

کردیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ جو کچھ بھی لکھوں گا وہ سچ لکھوں گا، اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں لکھوں گا۔"

"بنام کتاب" از فکر تونسوی مضمون مجتبیٰ حسین ص ۱۸۵ تا ۱۸۹)

یوسف ناظم جو یوسف کم ہیں اور ناظم زیادہ اپنی "نظامت ظرافت" سے فکر کے بارے میں یہ حکم صادر فرماتے ہیں۔

"فکر تونسوی کے متعلق میری رائے یہ ہے یہ صورت سے جتنے غبی نظر آتے ہیں تحریریں اس سے زیادہ ہوشیار چالاک اور مشاط ہیں۔ روزنامہ مزاح لکھنا معمولی کام نہیں ہے۔ ان کا سیاسی، سماجی شعور بھی قابل اعتراض نہیں۔"

(خط بہ نام راقم از یوسف ناظم مورخہ ۱۰ر فروری ۷۹ء)

بلراج ورما اپنے قلم کا زور دکھاتے ہوئے فکر کی مفکرانہ خصوصیات ان کی انشائیہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ان کی زبان بانکی شگفتہ رواں دواں اور پانی اور ہوا کی طرح آزاد ہے۔ ان کے فقرے بازی کانٹوں کی طرح نکیلی ہے اور پھولوں کی طرح دلکش و معطر، ان کے اسلوب بیان میں گرمی ہے۔ تپش نہیں تیزی ہے بہت تیزا نہیں لطافت ہے۔ کثافت نہیں۔ تفریح طبع کا سامان بھی ہے۔ وہ عریاں تو ہوتے ہیں بدقماش کہیں نہیں ہوتے۔ ان کی باتوں میں پھکڑ پن کی جھلکی تو اکثر ملتی ہے مگر سفلہ پن کہیں نظر نہیں آتا۔ ان کا تفریحی درد

تنقید نہیں ہمدردانہ شکوہ ہے۔"

(ماہنامہ شاعر (بمبئی) مدیر اعجاز صدیقی شمارہ نمبر ۱۱-۱۱ ۱۹۷۴ ء ص ۵۸)

یوں ہر ایک فکر اپنے اپنے طور پر اپنی اپنی ہمت کے مطابق فکر کی فکر کا جائزہ لیتی ہے اور فکر نے اردو طنز و مزاح میں جو کام کیا ہے اس کی داد دے کر داد خواں ہوتی ہے۔

فکر نے اپنے انشائیوں کے ایک مجموعہ کا نام "تیر نیم کش" بھی رکھا ہے۔ اصل میں ان کے انشائیوں پر یہ نام مکمل طور پر پورا اترتا ہے۔ فکر کے طنز و مزاح میں تیر نیم کش کی پوری خلش موجود ہے جو بظاہر تیر نیم کش ہونے کی وجہ سے جگر کے پار اترتی نظر نہیں آتی لیکن دل و جگر کے پار ہو جاتی ہے۔ فکر کا یہ طنز و مزاح کا تیر "واہگہ کے اس پار" سے چلا تھا۔ یہ وہ انشائیہ ہے جو ان کا طنز و مزاح کا پہلا نثری کارنامہ ہے۔ یہ "سنگ میل" (پشاور) میں شائع ہوا تھا۔ واہگہ کے اس پار سے چلایا ہوا یہ تیر اب ہندوستان کے قلب یعنی دلی بلکہ "دل ہی" میں پیوست ہو چکا ہے لیکن یہ تیر اب اور زیادہ خطرناک ہو چکا ہے اور لذت و کرب کی ایسی آماجگاہ بنا ہوا ہے جہاں دیر و حرم کا اتصال ہوتا ہے۔ اس نقطہ پر پہنچ کر فکر کے طنز کے تیر کے تعلق سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنا کام کر چکا ہے یعنی کام تو وہ کر چکا ہے اور کر رہا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا کام ختم ہو چکا ہے۔ فکر کے طنز و مزاح کے تعلق سے یہ بات نہیں سمجھنی چاہیے کہ وہ تیر نیم کش ہے اور وہ ظاہر ہے قلب میں اتر بھی جائے تو اس کی خلش کم نہیں ہوتی اور بڑھ جاتی ہے۔

فکر کا فن یہی خلش پیدا کرنے کا نام ہے فکر کا طنز و مزاح اپنی اسی خلش

انگیزی کی وجہ سے اردو ادب میں فکر و خیال کے نئے نئے میدان سر کر رہا ہے اور طنز و مزاح کی ایک سے بڑھ کر ایک چوٹی کو سر کرتا جا رہا ہے۔

فکر کے طنز و مزاح کے بارے میں اس طرح سے بہت کچھ کہنے کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فکر کے "دریائے طنز و مزاح" کے کنارے کھڑے سیپیاں چننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ فکر نے جتنا کچھ لکھا ہے اور جیسا کچھ لکھا ہے اس کا مکمل طور پر جائزہ لینا تو شاید ایک پی ایچ ڈی کے مقالہ میں ہی ممکن ہو سکے۔ لیکن یہاں اس بات کی ایک بوگس کوشش کی گئی ہے کہ فکر کے "طنزیات و مضحکات" کا جائزہ لینے کی شروعات کی جائے۔ اب یہ تو کہے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بسم اللہ صحیح ہے یا غلط اب یہ تو اہل نظر جائیں۔ فکر کے طنز کے بارے میں حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ کچھ اور نہیں تو اس کی "قامت اور قیمت" کا کچھ اندازہ ہو جائے۔ فکر کے طنز و مزاح کا مطالعہ کرنے کے بعد اور اس بات کے احساس کے بعد فکر نے جتنا بڑا سرمایہ اُردو طنز و مزاح کو بخشا ہے نہ اس کا جواب ملنا دشوار ہے اور اس اعتراف کے ساتھ بہت کچھ فکر کے طنز و مزاح کو پڑھ چکنے کے بعد یہ بات اور بھی تشنگی کا احساس بڑھا دیتی ہے اور فکر کے طنز و مزاح میں جو تیرِ نیم کش کی خلش ہے وہ اور بڑھ جاتی ہے۔

اس تشنگی اور اس خلش کے احساس کو اس شعر پر ختم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ع

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو

وہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

فارسی اور اردو میں طنز و مزاح کے اہم رجحانات

عربی، فارسی اور اردو ادب میں بعض باتیں مشترک طور پر ملتی ہیں اردو کی ادبی روایات کا سلسلہ فارسی ادب کی روایات سے گہرا رہا ہے اور خود فارسی عربی ادب سے متاثر رہا ہے۔

عربی میں طنز و مزاح کے نمونے قصیدے کی صورت میں ملتے ہیں اور قصیدے ہی میں جس طرح مدح کی جاتی ہے جب یہ مداحی جذبہ منفی صورت اختیار کر لیتا ہے تو ہجو کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو ہجو کی صورت اپنا لیتا ہے۔ قصائد میں جس طرح سے فخریہ انداز میں اپنے قبائل اور اپنے ممدوح کی تعریف کی جاتی تھی اس طرح سے ہجو میں عرب شاعر اپنے دشمنوں کا تمسخر اڑایا کرتے تھے۔ اور قبائلی تنازعات کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے تھے۔ بنی اُمیّہ کے دور میں جیسا کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے کہ ہجو ایک اہم سیاسی ہتھیار بن گئی تھی۔" اور جب فارسی اور جب فارسی تہذیب و تمدن عربی تمدن سے متاثر ہوا تو عربی تمدن

سے متاثر ہوا تو عربی کی بہت سی باتیں فارسی میں رواج پانے لگیں۔ فارسی میں بھی ہجو گوئی کی روایت عربی سے بے حد متاثر یا ماخوذ رہی ہے۔

غزنوی دور کے فارسی ادب میں طنز و مزاح کی مثالیں قال قال ملتی ہیں۔ البتہ سلجوقی دور میں ہجو گوئی کو معاشرتی اور سماجی اصلاح کے ایک حربہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ درباری فضا کی وجہ سے شعرا ایک دوسرے کی تضحیک و تذلیل کر کے اپنے آپ کو اونچا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور دربار میں اپنا مقام بنانے کے لیے اس طنزیہ یا ہجویہ انداز کو خاص طور پر ذریعہ بنایا جاتا تھا۔

فارسی ادب میں ہجو نگاری کی تعریف میں انوری بے حد ممتاز مقام کا مالک ہے۔ مولانا شبلی کے کہنے کے مطابق اگر ہجو گوئی کی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیمبر ہوتا۔" اس میں شک نہیں کہ انوری کی ہجویات اپنے موضوعات طریقہ اظہار اور علمی و فنی خوبیوں کی وجہ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن یہ محدود اور شخصی ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بجا طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان میں انتقامی عنصر غالب ہے اور ان کا دائرہ عمل فرد کی ذات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان میں انتقامی عنصر غالب ہے اور ان کا دائرہ عمل فرد کی ذات سے بلند ہو کر معاشرہ کی تصویر کشی تک نہیں جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ نظامی اور ابوالاعلیٰ گنجوی کی ذاتی رقابتیں ہجو کے حدود سے نکل کر ہزل اور فحاشی کے دائرہ میں پہنچ گئی ہیں۔ فارسی اور اردو کی طنز نگاری اور اس دور کے طنز و مزاح کا سرمایہ علم شخصی طور پر اور ذاتی مسائل تک محدود نظر آتا ہے۔ سنائی کی ہجو میں ایک نیا اور اہم رجحان یہ ملتا ہے کہ

وہ فرد ذات اور شخصیت سے ہٹ کر مقام شہر گاؤں اور قریہ کی اور مختلف مقامات کو اپنے طنز و مزاح کا ہدف بنایا ہے۔ سنائی نے تمام اہل بلخ کو اپنی ہجو گوئی کا نشانہ بنایا ہے۔ عمر خیام کی بذلہ سنجی اور شوخی اس زمانے کے عام سماجی اور معاشرتی زندگی پر تبصرہ کرتی یا طنز کرتی نظر آتی ہے۔ عمر خیام نے معاشرتی زندگی کے تضادات کو بڑی خوب صورتی سے اپنے طنز میں پیش کیا ہے۔ اس نے شوق ناصح اور واعظ کو اس تضا اور ریا کاری کی علامت بنا کر ان پر گہرا طنز پیش کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل میں شوخ واعظ زاہد، محتسب اور ناصح وغیرہ کا کردار اسی روایت کی غمازی کرتی ہیں

سنائی اور عمر خیام کے بعد فارسی ادب میں طنز و مزاح کو ایک اعلیٰ اور اونچا مقام دینے میں عبید زاکانی کا نام بھی یادگار رہے گا۔ عبید زاکانی کی فارسی ادب میں اس لیے بڑی اہمیت ہے کہ اس نے اپنے طنز و مزاح کے ذریعہ معاشرہ پر کڑی تنقید کی ہے اور سماج کی مختلف برائیوں کو اجاگر کر کے ان کی اصلاح کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ عبید زاکانی اپنے زمانے کی ناپسندیدہ اخلاقی اور اجتماعی خرابیوں کو بڑے سلیقہ سے نمایاں کرتا ہے۔ فارسی ادب میں طنز نگاروں اور ہجو نگاروں کی ایک لمبی فہرست ملتی ہے۔ فارسی کے ان طنز نگاروں اور ہجو نگاروں میں کمال اسمٰعیل کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے کہ شاعر نے نگاری کے فن کو ایک فن لطیف بنانے میں کامیابی حاصل کی تھی علامہ شبلی اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"شاعری پر سب سے بڑا احسان کمال کا یہ ہے کہ شاعری
کی ایک ایسی صنف یا ہجو یا ظرافت جو انوری اور سوزنی کی
وجہ سے لچوں کی زبان بن گئی تھی۔ کمال نے اس کو نہایت
لطیف اور پر مزاح کر دیا۔"
(شعر العجم حصّہ دوم از مولانا شبلی)

فارسی طنز میں نعمت خاں عالی کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے عالی نے نظم و نثر دونوں میں اپنے زمانے میں تنقید کی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے بیان کے مطابق نعمت خان عالی نے فارسی مزاح نگاری کو اوج کمال تک پہنچا دیا تھا۔ اس کے ہاں زندگی کی ناہمواریوں اور معاشرہ کے تضادات کی تصویر کشی جس اعلیٰ پیمانہ پر ملتی ہے ویسی کسی اور کے پاس ملنا مشکل ہے نعمت خان عالی نے "شہر آشوب" میں پیروڈی کے طور پر طنز اور تعریض کے پیرایہ میں زندگی کے مضحکہ خیز پہلوؤں کا خاکہ اڑایا ہے۔

عبید زاکانی نعمت خان عالی جیسے طنز نگار فارسی ادب میں بہت کم ملتے ہیں۔ جنہوں نے زندگی کی خرابیوں، سماج اور معاشرہ کی خرابیوں اور ان کی کمزور پہلوؤں کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے ورنہ فارسی میں عام طور پر ہجو اور مزاح شخصیات اور افراد تک محدود تھا۔ ذاتی اور شخصی طنز نگاری لازمی طور پر محدود ہوتی ہے اور اس میں تعمیر سے زیادہ تخریب ہوا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی عام طنزیات کی سطح کافی پست ہے اور سماجی و عام شخصی مفادات تک جب فارسی ادب محدود ہونے لگا تو لازمی طور پر اس میں ذاتیات کا رنگ بہت گہرا

ہو گیا۔ پھکڑ بازی ہزل اور فحش نگاری تک پہنچ گئی۔ فارسی طنزیات کے اس عام پہلو کی نشان دہی کرتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ۔

"فارسی میں ہجو نگاری کا معیار بہت پست رہا ہے افراد کی ہجو میں اکثر رکاکت اور فحاش کو دخل دینے لگتے ہیں لیکن ان کی مبالغہ آمیزی اور جدت طرازیوں کا جواب نہیں۔"

(طنزیات و مضحکات از رشید احمد صدیقی ص۳)

اردو طنز و مزاح کی روایات ملی تھیں۔ اس لیے ایک مدت تک اُردو میں بھی طنز و مزاح شخصی اور ذاتی چشمکوں تک محدود رہا۔ لیکن اردو ادب کے عروج کا زمانہ مغلیہ سلطنت کے انحطاط کا زمانہ تھا اور ملک کی افراتفری اور انتشار لازمی طور پر شاعروں اور ادیبوں کو بھی شخصی اور ذاتی سطح سے بلند ہو کر زندگی کو دیکھنے اور دکھانے پر مجبور کر رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا پہلا مزاحیہ اور طنز نگار شاعر جعفر زٹلی طنزیات اور مضحکات سے لیس دکھائی دیتا ہے اور اپنے زمانے کی عام زندگی پر طنز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ گو مجموعی اعتبار سے اس کے پاس بھی انفرادی ہجو کا پلہ بھاری ہی ملتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی وہ مجموعی انداز سے طنز کرتا ہے۔ جعفر زٹلی کا مزاح ایک طرف تو اردو اور فارسی کی ترکیبوں کی مضحکہ خیز آمیزش سے پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ معاشرہ کے انتشار اور انحطاط کی وجہ سے نمایاں ہوتا ہے۔ جعفر زٹلی کے

زمانے میں سیاسی زوال اور اخلاقی انحطاط نمایاں ہونا شروع ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس زمانے کی عام زندگی میں افراتفری انتشار اور تضادات پیدا ہو چکے تھے۔ جعفر زٹلی نے جو فردوسی کے شاہنامہ کی تحریف کی تھی۔ اور پیروڈسی میں فکر اور عمل کے تضاد کو واضح طور پر نمایاں کیا تھا۔ جعفر زٹلی نے بظاہر معمولی باتوں سے گہری معنویت پیدا کی۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس کی اس خصوصیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"زٹل کا یہ طریقہ کہ بظاہر معصوم اور بہ باطن گہری بات کہی جائے اس میں جعفر کا مقابلہ مشکل ہے۔"

(ماہنامہ اوراق لاہور ص ۳۶۶)

اردو طنز و مزاح کی شاعری میں جعفر زٹلی کی "زٹلیات" کے بعد نام سب سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور جسے اُردو طنز و مزاح کی تعریف میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے وہ مرزا محمد رفیع سودا کی شخصیت ہے سودا کے بارے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ "اردو طنزیات میں جعفر کی زٹلیات کے قطع نظر سودا کے علاوہ کوئی اور ہستی نظر نہیں آتی۔ لیکن اگر مصاحبہ اور طنزیہ انداز کو پیش نظر رکھا جائے تو اردو کے دور اول کے بعض شاعر اپنی ایہام گوئی کی وجہ سے طنز و مزاح کے پہلو پیدا کرتے نظر آتے ہیں۔ ایہام گو شعراء کے ہاں ایہام گوئی کی وجہ سے بعض وقت اچھا طنز و مزاح ابھرتا نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں نثار احمد فاروقی کا یہ خیال بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ

"آج بھی کسی ایہام گو شاعر مثلاً ناجی یا آبرو کا دیوان اٹھا کر

پڑھیے تو وہ سنجیدہ شاعری کی نہیں طنز و مزاح کی کتاب
معلوم ہوتی ہے۔"

(آج کل طنز و مزاح نمبر مدیر شہباز حسین مئی ۷۴ء)

طنز و مزاح کی تاریخ میں سودا بڑی قدآور شخصیت کے مالک ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی سودا کی شخصیت کا مقام متعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "سودا کو اُردو ہجو میں نہ صرف فضل تقدم حاصل ہے بلکہ ان کے کلام سے طنزیات کی بہترین صلاحیت و استعداد بھی نمایاں ہے۔" سودا کی غیر معمولی علمیت، قادر الکلامی زبان و بیان پر بے پناہ قدرت ان کے طنز و مزاح کو بڑی وقعت بخشتی ہے اور آج بھی ان کی ہجویات سرسبز و شاداب نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ بات بھی ان کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ سودا کی ہجویات عام طور پر شخصیات کے تعلق سے ہوتی ہیں۔ لیکن میرا ایسا خیال ہے کہ شخصیات و ذاتیات کا رنگ طنز و مزاح میں ایک کمزوری کی علامت بن جاتا ہے۔ میرے اس خیال کی تائید پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اس بیان سے ہو جاتی ہے کہ "ذاتی عناد و تعصب سودا کے پاس بھی نظر آتا ہے۔" سودا کے پاس گو شخصی اور ذاتی ہجویات کی کثرت ہے لیکن انھوں نے مجموعی طور پر اپنے زمانے اور اپنے عہد کی معاشرتی زندگی پر گہرا طنز کیا ہے۔" اس میں کوئی شک نہیں کہ سودا نے سماجی زندگی کی کمزوریوں اور تضادات کو بڑی عمدگی سے نمایاں کیا ہے۔ اور اس پر کڑی تنقید کی ہے۔ ان کی ہجویات میں قصیدہ "تضحیک روزگار" "ہجو شادی، فولاد خاں کوتوال" یا قصیدہ "شہر آشوب" بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ ان قصائد میں یا ان ہجویات میں سودا نے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی

مسائل پر گہرا طنز کیا ہے۔ اس زمانے کی طنز نگاری میں شہر آشوب کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ اس زمانے کے اکثر شعرائے نے شہر آشوب لکھے ہیں میر تقی میر نے بھی شہر آشوب لکھا تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اس زمانے میں جو شہر آشوب لکھے گئے تھے اس کے اسباب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"محمد شاہی عہد میں شہر آشوب بڑی کثرت سے لکھے جاتے ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ زمانے کے واقعات اور احساس زوال سے شعرا کا اثر پذیر ہونا بالکل قدرتی تھا چنانچہ ان نظموں میں اس دور پُر فتن کے واقعات کا پورا عکس ملتا ہے۔"

بحث و نظر از ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۴۶، ۴۷

اس زمانے میں جو شہر آشوب لکھے گئے تھے اس کے مطالعہ کے بعد اس زمانے کے زندگی کے مسائل ایک تصویر کی طرح ہمارے سامنے آتے ہیں اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو ادب میں طنز و مزاح انفرادی اور شخصی ہجویات سے بلند ہو کر اپنے زمانے کی عام زندگی کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنادیا ہے اردو طنز و مزاح کی یہ روایت جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔ سودا و میر کے زمانے میں شہر آشوب کے علاوہ مختلف چھوٹی چھوٹی چھوٹی مثنویاں ایسی لکھی گئی ہیں جس سے اس زمانے کے حالات پر طنز و مزاح کے اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں میر ضاحک قدوی فاخر مسکین اور بقا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بعض دوسرے شاعروں نے بھی کھٹمل نامہ اور سردی نامہ لکھے ہیں۔ اس طرح اپنے مکانوں کی خستہ حالی

مفلسی معاشرتی زندگی کا زوال اور سماجی زندگی کے بھیانک انتشار کو پیش کیا ہے۔ طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے اس رجحان میں "میر کا گھر" اور در ہجو موسم سرما بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور بعد کے دور میں مصحفی کا "کھٹمل اور سردی نامہ" میر حسن کی "ہجو حویلی" امتیازی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثنوی نگاری میں طنز و مزاح کی روایت کے ساتھ اُردو غزل میں طنز و مزاح کے مختلف پہلو زاہد، شیخ، ناصح اور واعظ سے چھیڑ چھاڑ پر ملتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا طنزیہ شاعری کی اس خصوصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کا تجزیہ یوں کرتے ہیں۔

"اردو شاعری میں زاہد کی چھیڑ چھاڑ کی رو اس نفسیاتی وجہ کے علاوہ اپنے زمانے کے سماجی بدنظمی، قنوطیت اور ماحول کے نئے قواعد و ضوابط کے خلاف ایک ردِ عمل کے طور پر بھی نمایاں ہوئیں۔ در اصل اس طویل زمانے میں جمہوریت کے تصور کی عدم موجودگی اور قومی کردار کی بزدلی اور ناگزیرگی کے باعث ملک کے ایک طبقہ نے سیاسی و سماجی مسائل پر راست نکتہ چینی کے بجائے مقاومت کمترین کا راستہ اختیار کیا اور اپنے جذبات کے تند و تیز بہاؤ کو زاہد اور محتسب کی طرف موڑ دیا۔"

(اردو ادب میں طنز و مزاح ص۲۵)

اُردو غزل میں طنز و مزاح کا یہ انداز جب دہلی سے لکھنو پہنچتا ہے تو وہاں کے مخصوص حالات کی وجہ سے اس میں بھی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی اس تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس زمانے میں اردو غزل میں وہ عناصر داخل ہوئے جو انشاء کے ہاں اچھل کود سوز کے ہاں بول چال اور چونچلا اور مصحفی کے نزدیک تیغ و بھالے کی شاعری ہے۔ شعراء اور ادبا کا نظریہ زندگی کے بارے میں پوری طرح غیر سنجیدہ ہوگیا۔ اس سے دو رجحان کھل کر سامنے آئے ۔۔۔۔۔ ایک تو لفظوں کی آوازوں سے مضحک کی صورتیں پیدا کرنے کا طریقہ ہے دوسرا رجحان شعری روایات جو مسلمات کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اس میں مضحک پہلوؤں کی دریافت ہے"

ص ۳۶۸

(ماہنامہ اوراق لاہور) سالنامہ و غالب نمبر ۶۹ء)

اردو غزل میں طنز و مزاح کی اس روایت کے ساتھ ریختی گوئی کی وجہ سے اردو طنز و مزاح ابتذال اور رکاکت کی طرف مائل ہوگیا اس لحاظ سے ریختی یقیناً طنز و مزاح کی تاریخ میں کسی صحت مند رجحان کو پیش نہیں کرتی۔ بہ حیثیت مجموعی اس زمانے میں لکھنؤ میں جو طنز و مزاح پیدا ہوا ہے وہ طنز و مزاح کو کسی بلند سطح پر لے جاتا نظر نہیں آتا بلکہ اس انحطاطی دور کے بعد پھر دہلی ہی میں طنز و مزاح بے حد بلند سطح پر پہنچتا ہے یعنی مرزا اسداللہ خاں غالب کی وجہ سے اردو طنز و مزاح کی تاریخ ایک بلند تر اور پرشکوہ انداز سے سامنے آتی ہے۔"

غالب کا "طنز و مزاح" اردو کی تاریخ کا انمول رتن ہے۔ غالب

غالب کے خطوط اپنی شگفتگی اور شوخی کے لحاظ سے اردو ادب کی لطیف ترین مزاح نگاری میں بھی سب سے مقدم ہے۔ غالب کی باغ و بہار طنز و مزاح نگاری نہ صرف بذات خود اہمیت رکھتی ہے بلکہ اس سے اردو میں طنز و مزاح کا حقیقی معنوں میں آغاز ہوتا ہے۔ اس بارے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں۔

"جہاں تک نثر اردو کا تعلق ہے برجستہ اور بے تکلف ظرافت کے اولین نمونے ہم کو غالب کے رقعات میں ملتے ہیں۔ طنز و ظرافت کی سب سے پہلے اردو نثر میں غالب نے داغ بیل ڈالی۔

(طنزیات و مضحکات از رشید احمد صدیقی)

غالب کا طنز و مزاح صرف ان کے مکتوبات ہی کی حد تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ ان کی شاعری میں بھی ان کا شوخ اور طنزیہ رنگ ایسی شگفتگی اور شادابی کی نشان دہی کرتا ہے جسے یقینی طور پر اردو ادب کے طنز و مزاح کی "آبرو" کہا جا سکتا ہے۔

غالب کے معاصرین میں طنز و مزاح کے سلسلہ میں جس کسی کا نام لیا جا سکتا ہے وہ واحد شخصیت نظیر اکبر آبادی غالب کے معمر معاصر ہیں۔ عام طور پر نظیر اکبر آبادی کا نام طنز و مزاح کے لیے نہیں لیا جاتا۔ لیکن ان کے پختہ سماجی شعور زندگی اور زندہ دلی کے اعتبار سے ان کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے پاس جو خاص قسم کی

خوش دلی ملتی ہے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت ان کا اظہار اور ان پر تنقیدی نظر انھیں طنز و مزاح نگاروں میں لا کھڑا کرتی ہے۔ نظیر کے پاس زندگی سے پیار اور زندگی کو بہتر بنانے کا جذبہ ملتا ہے۔ وہ اس جذبہ کے تحت زندگی کے ہر رخ کو دیکھتے اور دکھاتے ہیں اور زندگی پر تنقید کرتے ہوئے بے حد لطیف طنز و مزاح سے کام لیتے ہیں۔ بعض وقت یہ طنز یہ انداز پر پند و نصاح کا رنگ اتنا غالب آجاتا ہے کہ طنز و مزاح ان کے پاس ایک ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

غالب کے بعد بانی علی گڈھ سر سید احمد خاں اور ان کے رفقا کا دور آتا ہے۔ اگرچیکہ سر سید اور ان کے رفقا میں سے کسی کے پاس بھی طنز و مزاح کا رنگ نہیں ملتا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے زبان و بیان کی جو خدمت کی اور زبان و ادب کے راستہ کو جیسا اور جتنا ہموار بنایا اس کے نتیجہ میں طنز و ظرافت اردو ادب میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ آج اردو ادب میں جو طنز و مزاح کا سرمایہ ہے وہ یقینی طور پر سر سید اور ان کے رفقاء کی دین ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ طنز و مزاح کیلئے زبان کی وسعت اور بیان کی لچک لازمی اور ناگزیر ہے اور یہ دونوں باتیں سر سید اور ان کے رفقا کی وجہ سے اردو زبان و ادب کو حاصل ہوئیں۔

سر سید اور ان کے رفقا کی وجہ سے طنز و مزاح کو جو فائدہ پہنچا اس کا بین ثبوت اور روشن مثال اودھ پنچ ہے۔ اودھ پنچ اصل میں دہلی اور لکھنؤ اسکول کے تنازعہ کی ایک طرح سے کڑی ہے۔ سر سید کا تہذیب الاخلاق سنہ ۱۸۷۶ء میں بند ہوتا ہے اور اودھ پنچ کا اجرا سنہ ۱۸۷۷ء میں وجود میں

آتا ہے۔ اودھ پنچ کے طنز و مزاح کا ہدف یہی وجہ ہے کہ سرسید کی پوری تحریک اور ان کے رفقا بنتے ہیں۔ اگرچہ کہ لکھنؤ اور دہلی اسکول یا دبستان کے تنازعہ کا اس سلسلہ میں کبھی نام نہیں لیا جاتا۔ اس لیے کہ بہت سے لکھنؤ کا حضرات ہی نے اودھ پنچ کی بہت سی باتوں سے اختلاف کیا تھا جیسے چکبست نے جب مثنوی گلزار نسیم شائع کی تو اس میں حالی کے ان اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی تھی جو انھوں نے مقدمہ شعر و شاعری میں گلزار نسیم پر کیے تھے۔ اس کا جواب اور لوگوں کے علاوہ عبدالحلیم شرر نے بھی دیا تھا۔ اور شرر لکھنوی تھے لیکن ذہنی و فکری اعتبار سے وہ سرسید اور ان کے رفقا سے بے حد متاثر تھے۔ بہر حال اودھ پنچ کی وجہ سے اُردو ادب میں باقاعدہ طور پر طنز و مزاح شروع ہوتا ہے۔ اودھ پنچ جیسا کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ "سیاسی طور پر ترقی پسند تھا اور سماجی حیثیت سے قدامت پسند تھا" یہی وجہ ہے اودھ پنچ میں سرسید کی سماجی اصلاحوں کو اکثر و بیشتر طنز و مزاح کا نشانہ بنایا گیا تھا اور سیاسی طور پر سرسید کے نقطۂ نظر سے اعتراض کیا گیا تھا۔ اودھ پنچ نئی سیاسی تبدیلیوں کے حق میں تھا اور کانگریس کا موید۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں نثر نگار اور شاعر دونوں ہی تھے۔ اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین خود کئی ناولوں کے مصنف اور ممتاز اہل قلم تھے۔ منشی سجاد حسین اپنی اکثر ناولوں میں طنز و مزاح کے ذریعہ سماجی اصلاح کا کام لیتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں "حاجی بغلول" "احمق الذی"، "میٹھی چھری" اور کایا پلٹ اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام منشی سجاد حسین کے طنزیات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"سجاد حسین کا طنز سیاسی اور دل چسپ ہے مگر سطحی ہے"

(نقوش طنز و مزاح نمبر جنوری و فبروری سنہ ۵۹ء)

اودھ پنچ کے دوسرے کامیاب طنز و مزاح نگار نواب سید محمد آزاد ہیں۔ نواب آزاد کا طنز و ظرافت کس درجہ اہمیت رکھتا ہے اس کا اندازہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اس بیان سے ہوتا ہے۔

"نواب آزاد نے جس دل نشین اور معقول پیرایہ میں طنز کیا ہے اس کا جواب بہ حیثیت مجموعی اُردو ادب میں ملنا دشوار ہے۔ آزاد کی طنز و ظرافت میں جو چیز نہایت نمایاں اور بامزہ ہے وہ ان کی خلقی شگفتگی ہے کینہ پروری اور زہر ناکی کا عنصر کہیں نمایاں نہیں اس اعتبار سے ان کو اُردو ادب کا ہورلیس اور چاسر کہنا موزوں نہ ہوگا۔ آزاد نے ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی رجحانات پر نہایت جامعہ طریق سے اظہار خیال ہے۔"

(طنزیات و مضحکات۔ رشید احمد صدیقی ص ۶۴)

اودھ پنچ کے ایک اور مقبول و ممتاز طنز و مزاح نگار اکبر الہ آبادی ایک خاص امتیازی اور انفرادی مقام رکھتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کے بارے میں ڈاکٹر خورشید الاسلام کی رائے ملاحظہ کیجیے

"اکبر کی وسعت نظر، فنی شعور اور جذبہ کی شدت کسی کے حصہ میں نہیں آئی۔"

("نقوش طنز و مزاح نمبر مدیر محمد طفیل۔ جنوری فبروری سنہ ۵۹ء)

اکبر نے اپنے طنز و ظرافت کے ذریعہ ایک طرف تو مغربی تہذیب اور اس کی اندھی تقلید پر طنز و مزاح کے تیر برسائے تو دوسری طرف انھوں نے مشرقی قدروں کی اہمیت اور ضرورت کو ظاہر کیا۔ اکبر کا کارنامہ یہ ہے کہ ایسے دور میں جب کہ ملک اور قوم "آئین نو اور طرز کہن" کے اختلاط کی کٹھن منزل سے گزر رہی تھی۔ اس وقت انھوں نے توازن پیدا کیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اکبر کے طنز و مزاح کے بارے میں رکھتے ہیں۔

"فطرت کی جانب سے وہ ایک رسول ہو کر آئے تھے ان کا پیام اسی تحریک مغربیت کے خلاف ردعمل تھا۔ ان کی شاعری اول سے آخری تک اسی مادیّت اور مغربیت پرستی کا جواب ہے"۔

(رسالہ اردو۔ ماہ اپریل ۱۹۲۳ء صہ ۲۴)

اکبر کی طنز و ظرافت کی اہمیت یہ ہے کہ وہ کہیں بھی اور کبھی بھی ذاتی یا شخصی ہونے نہیں پاتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے سرسید پر بھی تنقید کی ہے۔ اور گاندھی کے نظریات سے بھی اختلاف کیا ہے۔ لیکن اکبر کے طنز و مزاح کا ہدف کسی کی شخصیت یا ذات نہیں بنتی بلکہ ان کے مسلک اور ان کی تعلیمات کو اکبر نے اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ اکبر کی ظرافت کے بارے میں ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں۔

"اکبر کے اکثر اشعار لفظی ظرافت کے اچھے نمونے ہیں روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والے مضحک پہلوؤں کو انھوں نے خوب جانچا اور پرکھا ہے ۔۔۔۔ اکبر کے

ان اشعار میں معنویت اور گہرائی نظر آتی ہے جن میں نئے علائم اور پرانی علامتوں کے لیے نئے اطلاقات کی مدد سے انھوں نے اپنے تہذیبی شعور کا اظہار کیا ہے۔"

(ماہنامہ آج کل طنز و مزاح نمبر مدیر شہباز حسین ص ۲۹ ؁۸۳ء)

اودھ پنج کے ایک اور سربرآوردہ لکھنے والے پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں۔ سرشار کی طنز و ظرافت کا شاہکار ان کا مشہور ناول "فسانہ آزاد" ہے۔ فسانۂ آزاد کے ذریعہ سرشار نے لکھنؤ کی زوال آمادہ اور مٹتی ہوئی تہذیب پر طنز کیا ہے اور لکھنؤ کی زندگی کے ہر کمزور پہلو کو اپنے طنز وظرافت کا نشانہ بنایا ہے۔ سرشار نے جس جامعیت اور گہرائی سے لکھنوی تہذیب کے ہر پہلو پر کڑی تنقید کی ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور کے الفاظ میں کہنا پڑتا ہے کہ "ان کے پاس دیوزادیوں کی وسعت خیال ملتی ہے۔" ڈاکٹر خورشید الاسلام فسانہ آزاد پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا طور پر ظہار خیال کرتے ہیں کہ

"آزاد رتن ناتھ سرشار کی مخلوق ہے لیکن مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خالق و مخلوق میں پردے حائل نہ تھے۔ آزاد مشرقی تھے لیکن مغرب کی ہر چیز کا استقبال کرتا ہے۔ اس میں خیال اور عمل کی بے پناہ قوتیں ہیں لیکن چونکہ ماحول میں ان کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیئے وہ زندگی کے ہر پہلو سے آشنا ہے اور بیشتر تعمیری تنقید کرتا ہے اور اس تنقید میں صحت مند طنز بھی ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کو خود پر

قابو نہیں ہے اس لیے الفاظ اور جذبات دونوں کو
فراخ دلی سے لٹایا ہے وہ مذہب، مکتب میں میکدہ
اور محلسراؤں کے ہر گوشہ کو چھو کر دیکھتا ہے اور دیکھ
کر چھیڑتا ہے۔"

(نقوش طنز و مزاح نمبر مدیر محمد طفیل ص۵۹)

اودھ پنچ کے چند ممتاز اور مستقل اہل قلم میں تربھون ناتھ ہجر اور مرزا مچھو بیگ، ستم ظریف مولوی سید عبدالغفور شہباز احمد علی کسمنڈوی احمد علی شوق۔ جوالہ پرشاد برق خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اودھ پنچ میں اردو ادب میں طنز و ظرافت کی خدمت انجام دی ہے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں۔

"پنچ ظرافت کا علمبردار تھا اور ظرافت کے اس بے پناہ
آلہ سے زندگی کے کسی شعبہ کو اپنے وار سے محفوظ نہ رکھا
اور اردو ادب میں اودھ پنچ اپنے قسم کا اولین پرچہ تھا
اور اکثر حیثیت سے وہ ظرافت و طنزیات کے رائج
الوقت معیار کا بہترین ترجمان تھا۔"

(طنزیات و مضحکات۔ رشید احمد صدیقی ص۸۸)

اودھ پنچ نے اردو طنز و مزاح کی کافی مدت تک اہم خدمت انجام دی اور اودھ پنچ کے دو دور رہے ہیں۔ پہلا دور ۱۸۷۷ء سے شروع ہو کر سنہ ۱۹۱۳ء پر ختم ہوتا ہے اور دوسرا دور دو سال کے بعد یعنی ۱۹۱۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ منشی سجاد حسین کے انتقال کے بعد شیخ ممتاز حسین عثمانی نے اسکو

دوبارہ جاری کیا اور اکیسویں صدی کے تیسری دہائی تک اس کو انھوں نے جاری رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن بعد میں ان کو بھی اسے بند کر دینا پڑا اور اودھ پنچ نے اپنے پہلے دور میں جو مقام اور مرتبہ حاصل کر لیا تھا اور جس اونچے درجہ کے طنز و مزاح نگار جمع کر لیے تھے پھر ویسے اہل قلم اودھ پنچ کو دوبارہ نصیب نہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے دور کے مقابلہ میں اودھ پنچ کا دوسرا دور ہر لحاظ سے پھیکا نظر آتا ہے۔

اودھ پنچ کے علاوہ اردو کے جو دوسرے رسالے طنز و ظرافت کے لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں ان میں اودھ پنچ کا ہمعصر رسالہ "فتنہ" اور "عطر فتنہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عطر فتنہ کے ایڈیٹر ریاض خیر آبادی تھے۔ یہ مختصر رسالے ڈاکٹر خورشید الاسلام کے الفاظ میں رساپچے بھی اپنے طنز و مزاح کے ذریعہ سماجی اصلاح کا کام انجام دیتے رہے۔

اودھ پنچ نے اردو طنز و ظرافت پر بڑے دوررس اثرات مرتب کیے۔ اخبار کے لیے طنز و ظرافت کی اہمیت بھی اودھ پنچ کے ذریعہ اردو داں طبقہ کے سامنے آئی۔ خود اردو صحافت بھی اودھ پنچ سے بے حد متاثر رہی اور اودھ پنچ کی تقلید میں کئی طنزیہ و مزاحیہ رسالے اور اخبار جاری ہوئے اس لحاظ سے اودھ پنچ کو اردو صحافت میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے تین بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ اودھ پنچ کو اردو کا پہلا مزاحیہ اخبار ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ذریعہ اردو میں مغربی طنز و مزاح کے گُر استعمال کرنے کی بنیاد پڑی۔ دوسری بات یہ کہ سیاسی اور سماجی مسائل کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنانے کا آغاز

بھی اودھ پنچ سے ہوا۔ اودھ پنچ سے پہلے صرف نکتہ چینی ہوتی یا تنقید ہوتی۔ لیکن اودھ پنچ نے ظرافت اور ... مزاح کا عنصر شامل کر کے سخت ترین نکتہ چینی اور تنقید کو بھی گوارا بنانے کی کامیاب کوشش کی۔ تیسری بات یہ کہ "اودھ پنچ وہ پہلا اردو اخبار تھا جس میں کسی خاص واقعہ کے متعلق اپنی رائے دینا یا کسی چیز کے مضحک پہلو کو نمایاں کر کے پیش کرنے یا محض حریف کو ذلیل کرنے کے لیے کارٹون بھی استعمال کیے۔

انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اودھ پنچ کا دوسرا دور بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اودھ پنچ نے طنز و مزاح کی جو روایت قائم کی تھی وہ اتنی مستحکم اور مقبول ثابت ہوتی ہے کہ اودھ پنچ کے ساتھ ساتھ مختلف رسالے اور اخبار طنز اور ظرافت کے راستہ کو اختیار کرنے لگتے ہیں اور اودھ پنچ کی تقلید میں اس نام کے مختلف اخبار ہندوستان کے مختلف مقامات سے نکلنے لگتے ہیں۔ اس طرح سے سارے ہندوستان میں ایک "پنچی لہر" پھیل جاتی ہے۔ اور پنچی اخبارات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اودھ پنچ کے اجراء کے دو ہی سال بعد ۱۸۷۹ء میں پنجاب سے "پنجاب پنچ" نکلتا ہے۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں بنگال "پنچ" اور دہلی سے دہلی پنچ کا اجراء عمل میں آتا ہے۔ سنہ ۱۸۸۱ء میں "باوا آدم پنچ" اور "راجپوتانہ پنچ" جاری ہوتے ہیں سنہ ۱۸۸۱ء میں بمبئی سے "سرپنچ" کا آغاز ہوتا ہے۔ سنہ ۱۸۸۵ء میں " جعفر زٹلی دکن پنچ" شائع ہوتا ہے۔ سنہ ۱۸۸۶ء میں میرٹھ سے "سرپنچ" کے نام سے اخبار جاری ہوتا اس کے علاوہ طنز و مزاح کا رنگ اختیار کیے ہوئے مختلف رسالے

اور اخبار شائع ہوتے ہیں۔ جیسے ۱۸۸۷ء میں "چلتا پرزہ" اور "طلا دپیازہ" شائع ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح بانکی پور پنچ "پاٹے خاں" "شیخ چلی" اور البیلا بھی منظر عام پر آتے ہیں۔ اس پنچ لہر کا سلسلہ اودھ پنچ کے بند ہو جانے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۳۱ء میں لکھنؤ سے سرپنچ جاری ہوتا ہے۔ سرپنچ کو بھی کافی مقبولیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ اس نے بھی بقول ڈاکٹر سیدہ جعفر:

"بہت جلد اپنے کالموں، کارٹونوں اور مزاحیہ تخلیقات سے اردو داں طبقہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔"

(آج کل طنز و مزاح نمبر ۷۴ء ص ۳)

اس طرح جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اُردو ادب میں طنز و مزاح کا دائرہ نہ صرف وسیع ہوتا گیا بلکہ اس کے وقار اور اہمیت میں بھی روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ مغربی تعلیم اور مغربی ادب کا اثر بڑھتا گیا۔ قومیت کا جذبہ بنیادی اور مجموعی حیثیت حاصل کرتا گیا۔ آزادی اور جمہوریت کے تصورات عام ہونے لگے اور اس کی وجہ سے ذہنی آزادی اور قومی تشخیص اور قومی سرمایہ کو کھنگالنے اور پرکھنے اور پیش کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ اس تعلق سے ڈاکٹر خورشید الاسلام بجا طور پر تحریر کرتے ہیں کہ۔

"اب معاشرت اور سیاست ہی نہیں بلکہ آئینی اور مابعد الطبیعاتی قدریں بھی طنز و ظرافت کا مواد اور نشانہ بن گئیں۔"

(ماہنامہ شگوفہ، مدیر سید مصطفیٰ کمال ۶۷ء ص ۱۰)

اردو طنز و مزاح میں یہ جو تبدیلی ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو کے اہم

اور اونچے درجہ کے اہل قلم طنز و مزاح کے پیرایہ کو اپنانے لگے۔ جیسا کہ اس سے پہلے کہا جا چکا ہے کہ طنز و ظرافت کو عام کرنے اور اردو ادب میں اونچا مقام دلانے میں اردو صحافت نے بڑا اہم کام انجام دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے بڑے بڑے مشہور اور چوٹی کے اہل قلم طنز و مزاح کے تیر برساتے نظر آتے ہیں جیسے مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنے موقر رسالہ "الہلال" کے ذریعہ طنز و مزاح کو اردو ادب میں اہمیت بخشنے میں نمایاں کام کیا ہے۔ اس زمانے کا دوسرا اہم اخبار "ہمدرد" ہے جو مولانا محمد علی جوہر کے زیر ادارت دہلی سے نکلتا تھا۔ جس میں خود ان کے علاوہ ممبوق اور سید محفوظ علی بدایونی کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین چھپا کرتے تھے۔ اس طرح "زمین دار" کا اجرا بھی قابل ذکر ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کے والد مولانا سراج الدین علی خاں کے والد مولانا سراج الدین علی خاں لاہور سے زمین دار نکالا کرتے تھے۔ یہ پندرہ روزہ اخبار تھا۔ والد کے انتقال کے بعد ظفر علی خاں نے اس کو روزنامہ بنا دیا۔ زمین دار کے مختلف کالم بھی طنز و مزاح کے لیے مخصوص ہوا کرتے تھے۔ خود ظفر علی خاں کی طنزیہ شاعری اس اخبار کی زینت ہوا کرتی تھی۔ اور انھوں نے اپنا قلمی نام نقاش رکھ لیا تھا۔ عبدالمجید سالک کا فکاہی کالم بھی طنز و مزاح کو اردو میں عام کرنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا سلسلہ بھی اودھ پنچ ہی سے شروع ہوا تھا۔ الہلال میں بھی فکاہی کالم ہوا کرتے تھے۔ اور غلام رسول مہر "افکار و حوادث" کے نام سے یہ کالم لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں یہ کالم مولانا عبدالمجید سالک کو دے دیا گیا تھا۔ بعد میں جب زمین دار جاری ہوا تو مولانا عبدالمجید سالک زمین دار میں اس نام سے یعنی افکار و حوادث کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں عبدالمجید

سالک زمین دار سے علیحدہ ہو گئے اور جب "انقلاب" نکلنے لگا تو عبدالمجید سالک اس سے منسلک ہو گئے اور یہ کالم یعنی افکار و حوادث" اپنے ساتھ لے گئے۔

طنزیہ اور مزاحیہ کالم کی یہ روایت اُردو میں بے حد مقبول ہوئی اور اس کو بڑے بڑے اہل قلم نے زندگی دی۔ جن میں مولانا چراغ حسن حسرت عبدالماجد دریابادی قاضی عبدالغفار احمد ندیم قاسمی مجید لاہوری شوکت تھانوی اور انتظار حسین وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ صحافت کے ساتھ ادب میں بھی طنز و مزاح کے اہم رتبہ اور وقار عطا کرتے ہیں جدید دور کے مشہور اہل قلم نے بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ ادبی حیثیت اور مرتبہ کے ساتھ جن ادیبوں نے طنز و مزاح کے ادب کو پروان چڑھایا ان میں سجاد انصاری اور مہدی افادی کے نام بھی قابل توجہ ہیں۔ ان دونوں کے یہاں طنز نگاری اور بزلہ سنجی کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام کے کہنے کے مطابق ان کے یہاں:

"انسانی اور آفاقی قدریں بھی ملتی ہیں۔ یہ کسی محدود نقطۂ نظر کے خلاف نہیں، امارت کے خلاف ہیں، وہ امارت عقیدہ کی ہو علم کی ہو یا پرہیز گاری کی یہ دونوں حسن کی امارت کے قائل ہیں۔ ایک طنز نگار ہیں دوسرا بزلہ سنج اور خوش وضع، دونوں نفاست کے قائل ہیں دونوں مولوی کے دشمن۔ دونوں کے یہاں تشکیک ہے۔ .... فرد کی آزادی عقیدہ کی آزادی اور حسن پرستی، ان کی بہترین قدریں ہیں۔" (ماہنامہ شگوفہ ۶۷ء صفحہ ۱)

مہدی افادی اور سجاد انصاری کی طرح مولوی دشمنی اور حسن پرستی کے لحاظ سے نیاز فتح پوری کی طنزیہ اور مزاحیہ تحریریں بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ نیاز فتحپوری کے خطوط ان کے طنز و مزاح کا بہترین نمونہ ہیں۔

قاضی عبدالغفار بھی اردو طنز نگاری میں ایک امتیازی مقام کے حامل ہیں۔ قاضی عبدالغفار کے لیلیٰ کے خطوط ان کی طنز نگاری کا شاہکار ہیں جس میں انھوں نے ہندوستانی سماج پر بھرپور طنز کیا ہے اور یہ بات بڑے چبھتے ہوئے طنزیہ انداز سے ظاہر کی ہے کہ کس طرح سے وہ عورت جو ماں بننا چاہتی تھی، اور زندگی کو اپنی محبت اور شرافت سے بہتر بنانے کی آرزو رکھتی تھی وہ کس طرح سے سماجی ظلم کے ہاتھوں طوائف بن گئی اس طرح سے سماجی زندگی کے مختلف مظاہر پر عظیم بیگ چغتائی نے بھی گہرا طنز کیا ہے۔ ان کے مختلف ناولوں اور افسانوں میں ہندوستانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نہ صرف طنز و مزاح کے بھرپور وار کیے گئے ہیں بلکہ ان کی کمزوریوں کو بے نقاب بھی کیا گیا ہے۔

اردو کے دوسرے اہم اور قابل قدر ادیبوں میں جن کے پاس طنز اور مزاح نمایاں صورت میں نظر آتا ہے۔ ان میں خواجہ حسن نظامی، ملا رموزی، امتیاز علی تاج، منشی پریم چند اور سلطان حیدر جوش قابل ذکر ہیں۔ ملا رموزی کی "گلابی اردو" میں طنز اور مزاح کی چھوٹ پڑتی نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس میں پرانے زمانے کے مولویوں کی زبان اور طرز اظہار کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔"

ان لکھنے والوں کے دور کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ رشید احمد

صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، غلام احمد فرقت کاکوروی، شفیق الرحمٰن، کنہیالال کپور، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ابراہیم جلیس، احمد ندیم قاسمی، راجہ مہدی علی خاں، سید محمد جعفری، فکر تونسوی، جوش ملیح آبادی، خواجہ احمد عباس، علی عباس حسینی، شاد عارفی، یہ تمام ادیب و شاعر ایسے ہیں جن کی وجہ سے طنز و مزاح کی تاریخ قابل فخر بن گئی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا کام انفرادی طور پر اتنا اور ایسا ہے کہ ہر ایک پر مستقل تصنیف ہو سکتی ہے۔ یہاں اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ ان مختلف طنز و مزاح نگار ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کا انفرادی طور پر جائزہ لیا جا سکے۔ ان میں اکثر فکر تونسوی کے ہم عصر ہیں اس لیے فکر کی طنز نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ان میں سے اکثر ذکر آنا ناگزیر ہے۔ اس لیے آئندہ ابواب میں ان کی طنز و مزاح نگاری کا انفرادی رنگ اور اُردو شعر و ادب میں ان کی جو خدمات ہیں اس کا تذکرہ کیا جائے گا۔

فکر تونسوی کے ہم عصر طنز و مزاح نگار ادیبوں اور شاعروں میں جنھوں نے اُردو طنز و مزاح میں ایک خاص مرتبہ اور مقام حاصل کیا ہے ان میں کرنل محمد خاں، مشتاق احمد یوسفی، بھارت چند کھنہ، مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھر، رشید قریشی، کنہیالال کپور، ڈاکٹر زینت ساجدہ، شفیقہ فرحت، مسیح انجم، وجاہت علی سندیلوی، پرویز یداللہ مہدی، یوسف ناظم، برہان حسین، لئیق صلاح، ایم اے حنان، حبیب ضیاء، ارشد علی خاں۔ جے ایس کندرا، تخلص بھوپالی، ابراہیم جلیس، شوکت تھانوی، رئیس احمد جعفری، غلام سرور خاں ڈنڈا، سلیمان خطیب، نذیر دہقانی، غلام احمد فرقت کاکوروی

احمد جمال پاشاہ، اعجاز حسین، کھٹا، سلمی صدیقی، محمد حمایت اللہ، ہلال سیوہاروی، مقرب حسین، رضا نقوی واہی، اسرار جامعی، ہلال رامپوری ناظم انصاری، ناظر خیامی، مرزا شکور بیگ، مائل لکھنوی، آفتاب لکھنوی، عادل لکھنوی، مسٹر لکھنوی، مشتاق پردیسی، ابرار ساغر، صابر بہاری، طالب خوندمیری، گڑبڑ حیدرآبادی، سریٹ حیدرآبادی، مصطفٰے علی بیگ، رشید سمیع جلیل، محمود نشتر، اسمٰعیل ظریف، کلیم میدگی، ان پڑھ بھونگیری، صبغۃ اللہ بھباٹ، حفیظ خاں مذاق، برق آشیانوی، گلی نلگنڈوی، فیض الرحمٰن فیض، بھوبٹ کریم نگری، پاگل عادل آبادی، مخمل مدراسی، بے دھڑک مدراسی، ڈھکن رائچوری، قادر حیدرآبادی، سید نصرت، فیروز حیدر، اشرف خوندمیری، اصغر جمیل انصاری، علی صاحب میاں، جگر نظام آبادی، اظہر افسر اور اسمٰعیل آذر

اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں یہ سرسری جائزہ اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ اس کو سامنے رکھ کر ایسے ادیبوں کے کاموں کا خاص طور پر جائزہ لیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو سکے ان کی انفرادیت کو نمایاں کر کے فکر تونسوی نے اردو طنز و مزاح کو جو کچھ دیا ہے اس کا جائزہ تفصیل سے لیا جا سکے اور اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں ان کے مقام اور مرتبہ کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ اس جائزہ میں ایسے بہت سے نام چھوٹ گئے ہوں جن کا ذکر کرنا یہاں ضروری ہو لیکن چونکہ ہمارا مقصد طنز و مزاح نگاروں کے ناموں کی فہرست پیش کرنا نہیں ہے بلکہ ان میں سے جو نمائندہ طنز و مزاح نگار ہیں اور جن کے ذکر سے فکر کے مقام اور مرتبہ کے تعین میں مدد مل سکے۔ صرف ان ہی ناموں تک اپنے آپ کو محدود رکھنے کی کوشش

کی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ متذکرہ بالا طنز و مزاح نگار بعض ادیب و
شاعر ایسے ہیں جو ابھی طنز و مزاح کے میدان میں نووارد ہیں لیکن ان میں سے
بعضوں کا طنز و مزاح کا سرمایہ ایسا ہے جن پر تفصیلی تو نہیں مختصراً گفتگو
ضرور کی جا سکتی ہے۔ میرا ایسا خیال ہے کہ آج کے یہی نووارد طنز و مزاح نگار
شاعر و ادیب کل کے اونچے و اعلیٰ مرتبہ کے طنز و مزاح نگار بن سکتے ہیں۔ ○○

فکر جولاحق تھی!

اللہ تبارک و تعالیٰ کا بے حد شکر ہے کہ اُس نے اپنے انتہائی حقیر ترین برگستں بندے کو صاحب کتاب بننے کی توفیق و صلاحیت عطا فرمائی۔

راقم الحروف کو ایم۔ اے کے سالِ آخر سے ہی فکر لاحق ہو گئی تھی کہ مقالہ کا موضوع اہم اور فکر انگیز ہو۔ کیونکہ اچھے موضوع کا انتخاب بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ موضوع کی تلاش میں اور دریائے فکر میں غواصی کے بعد جو کچھ حاصل ہوا وہ 'دُرِ فکر' تھا۔ لیکن جو دُر ہاتھ لگ جائے، ضروری نہیں کہ وہ حقیقی معنوں میں دُر ہی ہو۔ جب "دُرِ فکر" ہاتھ لگا تو اس "دُرِ مُراد" کو استاد محترم ڈاکٹر رفیعہ سُلطانہ، صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ کی خدمت میں پیش کیا۔ دُرِ فکر کی پیش کشی کے بعد اس کی قدر و قیمت کی فکر دامن گیر ہوی اور پھر 'موضوعِ فکر' کے انتخاب کے بعد کام کو انجام دینے کی فکر لاحق ہوی۔

فکر تونسوی کی شخصیت اور طنز نگاری پر کام کرنے کا اصل سبب یہ ہے کہ اُردو ادب میں طنز و مزاح پر اتنا کام نہیں ہوا ہے، جتنا کہ ہونا چاہیئے تھا اور خصوصاً اُردو کے طنز و مزاح نگاروں پر نا قابلِ غور کام ہوا ہے۔

بقول کرشن چندر، فکر تونسوی، اُردو کے عظیم طنز نگار ہیں، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اس عظیم طنز نگار پر اب تک کسی بھی قسم کا، کسی بھی انداز سے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ ان کی طنز نگاری پر آج تک کسی نے ایک مضمون بھی نہیں لکھا۔ چنانچہ ذہنِ بوگسں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ فکر تونسوی کی طنز نگاری اور ان کی زندگی کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

فکرؔ اُردو کے ممتاز طنز نگار ہیں، جن کی انفرادیت صرف اس بات سے ظاہر ہے کہ وہ پچیس سال سے مختلف عنوانوں سے طنزیات و مضحکات پیش کر رہے ہیں۔ اس بات سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے کہ 'پیاز کے چھلکے' کا کالم نگار (۱۸) کتابوں کا مصنف بھی ہے۔

فکرؔ، بڑی لاابالی شخصیت کے مالک ہیں۔ اِن کے پاس نہ تو اپنے خاندان کا شجرہ ہے نہ ہی ان کی تصنیف کی ہوی جملہ کتابیں ہیں۔ حد یہ ہے کہ ان کے پاس 'پیاز کے چھلکے' کے کالم کا ریکارڈ بھی نہیں۔ ان کی شخصیت اور ان کی طنز نگاری کے مختلف گوشوں کو تلاش کرنے میں بڑی دِقتوں کا سامنا کرنا پڑا ــــــــ

فکر کی شخصیت اور طنز نگاری کے بارے میں یہ کام حرفِ آخر نہیں ہے، لیکن بوگس یہ کہنے کی جسارت کرسکتا ہے کہ یہ حرفِ آخر ہو یا نہ ہو "حرفِ آغاز" ضرور ہے۔

مقالہ کی تیاری کے دَوران اُستادِ محترم ڈاکٹر یوسف سَرمست، ریڈر جامعہ عثمانیہ کی شفقتیں خلوص اور قدم قدم پر مجھے جن مشوروں سے نوازا گیا اور استاد محترم کا اپنے بوگس شاگرد کے ساتھ جو سلوک بیک وقت اُستادانہ، دوستانہ، ہمدردانہ اور بے تکلفانہ رہا ہے، اُسے میں بھول نہیں سکتا، اور نہ اس کے لیے ممنونیت کے میرے پاس الفاظ ہیں۔

راقم الحروف اپنے آپ کو اپنی والدہ محترمہ کے قدموں پر سَر رکھا ہوا، اپنی زندگی بھر محسوس کرتا رہے گا، جن کے ہاتھ ہمیشہ دُعائے نیم شبی میں میرے لیے اُٹھے رہتے ہیں۔

میں ممنون ہوں جناب بھارت چند کھنہ آئی۔ اے۔ ایس کا جنہوں نے ایک انتہائی بوگس کی کتاب پر پیش لفظ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اُستادِ محترم ڈاکٹر یوسف سَرمست نے مجھے اپنا پہلا اور آخری شاگرد تسلیم کیا ہے اور اپنے تعارفی مضمون سے نوازا ہے۔

سَعادت بھائی (سعادت علی خاں) ملک کے ممتاز آرٹسٹ ہیں، میری حقیر گزارش پر انھوں نے انتہائی فکر انگیز سرورق بنایا ہے۔

جناب سلام خوشنویس، جو ملک کے ممتاز خوش نویسوں میں اہم مقام رکھتے ہیں، ان سے کتاب کے ابتدائی و آخری صفحات لکھوائے گئے۔ جناب محمد غالب جنھوں نے پورے مقالہ کی کتابت کی اور جناب محمد سلیم کا بھی جنہوں نے کتاب کے عنوانات لکھے۔

ھسایں اپنے احباب جناب محمد حمایت اللہ — بانیِ زندہ دلانِ حیدرآباد، جناب مصطفےٰ کمال، مدیر شگوفہ، جناب طالب خوندمیری، جناب مسیح انجم اور جناب ایم۔ آر اسلام کا جن کے مشورے، تعاون و اشتراک، ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے۔ مسیح انجم کا خصوصی طور پر اس لیے کہ انھوں نے میری اُنگلی پکڑ کر مجھے پریس کی دُنیا تک پہنچایا۔

نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے پروپرائٹر کا، جنہوں نے انتہائی کم وقت میں میری کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری قبول فرمائی۔

اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کا، جس کا "جزوی تعاون" کتاب کی اشاعت و طباعت میں شامل ہے۔

آخر میں، اپنی پہلی اور آخری رفیقۂ حیات کا، جس نے ہر موقع اور ہر مرحلہ میں میری حتی المقدور مدد کی ہے۔ میں اپنی شادی کے وقت صرف میٹرک تھا، شادی کے بعد ایم۔ اے کرنے تک میری اہلیہ نے ہر قسم کی مشکلیں اور صعوبتیں برداشت کرکے مجھے صاحبِ اولاد تو بنایا ہی تھا "صاحبِ کتاب" بھی بنادیا۔

یکم مئی ۱۹۸۰ء (دستخط) (بوگس حیدرآبادی)

التماس!

آپ نے یقیناً پوری کتاب کا مطالعہ کیا ہوگا، کہیں کہیں کتابت کی کسی غلطی کی وجہ سے آپ کی ابرو پہ شکن آئی ہوگی۔ حتی المقدور کتابت کی تصحیح کی گئی ہے، پھر بھی اگر کہیں غلطی رہ گئی ہو تو اُسے براہِ کرم درست کر دیں، تاکہ دوسرے پڑھنے والے کی ابرو پہ شکن نہ آنے پائے۔

کتاب میں جو حوالے دیے گئے ہیں، بعض حوالہ جات انگریزی سے ترجمہ کیے ہوئے، پہلے ہی سے موجود تھے، میں نے جوں کا توں وہی ترجمہ پیش کر دیا ہے، بعض ترجمے میں نے اپنی طرف سے کیے ہیں۔ اگر متن کا پورا خیال نہیں رکھا گیا ہو تو اُسے بھی نظر انداز کر دیں۔

طنز و مزاح پر بہت سی کتابوں اور رسائل کے علاوہ۔ رشید احمد صدیقی کی 'طنزیات و مضحکات'، ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "اُردو ادب میں طنز و مزاح" مقالے کی تیاری میں بہت زیادہ استفادہ کا باعث بنے ہیں۔ "مصنف"

پہلی بار" انتہائی پچھڑے سادات گھرانے میں ۱۰ ر اکتوبر ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوا۔ نام سید شاہ خواجہ نصیرالدین احمد قادری رکھا گیا۔ مدرسہ میں مختصر نام کی خاطر شاہ، خواجہ اور قادری نہیں لکھوایا گیا۔ ددیال کٹر سیدوں کا ہے، دادی صاحبہ کہا کرتی تھیں کہ ہمارے پاس پانی کا چراغ جلا کرتا تھا اور چونے کی کھیر کھائی جاتی تھی۔ اب پانی ملے ہوئے کیروسین سے چراغ جلتا ہے اور پان میں چونا کھایا جاتا ہے۔ ننھیال شجیع مغلوں کا ہے۔ پردادا مدراس کے صدر قاضی تھے، آخری عمر میں مجذوب ہو گئے تھے، حالتِ جذب میں گنبدِ خضرا کی جالی مبارک پکڑے ہوئے روح پرواز ہو گئی، وہیں دفن ہوئے۔ دادا ناظرِ تعلیمات وکیل ہائیکورٹ، حضرتِ داغ کے شاگرد تھے۔۔۔ والد محترم عثمانین ہونے کے علاوہ محکمہ مہتمی تعلیمات حیدرآباد و تلنگانہ پر سپرنٹنڈنٹ تھے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں ہائی اسکول کے زمانے ہی سے شاعری (سنجیدہ) کے جراثیم نہیں بلکہ مینڈک اچھلنے کودنے لگے تھے۔ مجاہد عجمی تخلص تھا (اب بھی کبھی کبھی ہے) شاعری کے ان ہی مینڈکوں کی وجہ سے میٹرک کا امتحان دو مرتبہ دیا اور فیل ہو گیا۔ والد صاحب مجھے اس کنوئیں سے نکال لائے سنہ ۱۹۶۲ء میں نان میٹرک بیسک ٹیچرس ٹریننگ دلوائی۔ ٹریننگ اسکول کے میگزین "نئے چراغ" کا ایڈیٹر رہا۔ سنہ ۱۹۶۴ء میں ٹڈل ٹرینڈ ٹیچر کی حیثیت سے گورنمنٹ اسکول پر تقرر ہوا۔ سنہ ۱۹۶۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے امتیازی نمبروں کے ساتھ میٹرک پاس کیا۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں میٹرکی ٹریننگ کی۔ ٹریننگ کے دوران۔۔۔ ۲۶ ر جنوری سنہ ۱۹۶۹ء کو پہلی اور آخری شادی حیدرآباد کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔ شریکِ حیات پڑھی لکھی ہیں، اس لیے تین لڑکے اور دو لڑکیوں کی والدہ محترمہ ہیں۔ بچوں کی والدہ کی خواہش پر سنہ ۱۹۷۰ء میں اردو آرٹس ایوننگ کالج میں پی۔ یو۔ سی میں داخلہ لیا۔ سنہ ۱۹۷۴ء میں بی۔ اے درجۂ دوم سے کامیاب کیا۔ کالج میگزین "پھولبن" کا مدیرِ اعلیٰ رہا۔ سنہ ۱۹۷۴ء میں حیدرآباد ایوننگ کالج (عثمانیہ یونیورسٹی) میں ایم۔ اے کے لیے شریک ہوا۔ سنہ ۱۹۷۶ء میں ایم۔ اے درجہ اوّل سے الحمدللہ کامیاب ہوا۔

سنہ ۱۹۶۰ء سے مزاحیہ شاعری شروع کی۔ یہی بوگس شاعری ہے، جس نے سارے ہندوستان کا سفر کروایا ہے زندہ دلانِ حیدرآباد کے پہلے انتخابات سنہ ۱۹۶۲ء میں ہوئے۔ بوگس ترین کو زندہ دلانِ حیدرآباد کا پہلا آرگنائزر بنایا گیا۔ اب اسی ادارہ سے اپنی بوگس وابستگی برقرار رکھا ہوں۔

زیرِ نظر کتاب پہلی بوگس کوشش ہے۔ اللہ کرے ساری کتب بک جائیں۔ آمین ۔۔۔ تب اپنا مزاحیہ مجموعۂ کلام "واہ" چھپواؤں گا۔

